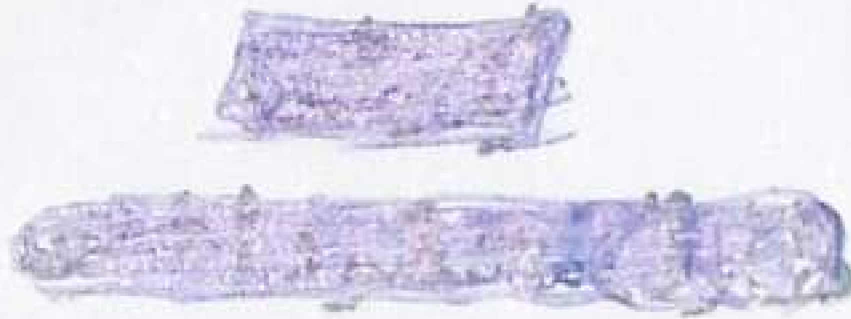
# عکسِ خیال

## شہناز مزمل: ایک تعارف

مرتبہ:

نعمانہ فاروق



پہچان پبلی کیشنز، لاہور

ایل - جی - ۱۲۰ حفیظ سنٹر گلبرگ لاہور۔

انتخاب جدید پریس لاہور

## ضابطہ

| | |
|---|---|
| نام کتاب | عکس خیال |
| مرتبہ | نعمانہ فاروق |
| ایڈیٹر | طارق محمود احسن |
| سن اشاعت | 1995ء |
| ایڈیشن | اول |
| قیمت | 80روپے |
| صفحات | 200 |
| ناشر | پہچان پبلی کیشنز لاہور |

## تقسیم کنندگان

| | |
|---|---|
| مقبول اکیڈمی | مال روڈ لاہور |
| عمیر پبلشرز | میاں مارکیٹ اردو بازار لاہور |
| نفیس نیوز ایجنسی | بنک سکوائر مارکیٹ ماڈل ٹاؤن لاہور |

(1)

# حسن ترتیب

## مضامین

## انٹرویوز



## خطوط



جرات اظہار
طفیل ہوشیار پوری
شہرت بخاری
جذب و حروف
شہزاد احمد
سعد اللہ شاہ
عکس دیوار پہ تصویر
منصور آفاق
فیصل حنیف
کلثوم برنی
نادر رسوا
رحمن العظم ہاشمی
پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد

موم کے سائبان
منیر نیازی
ڈاکٹر انیس ناگی
روحی کنجاہی
عطاء الحق قاسمی
نذیر قیصر
سعد اللہ شاہ
کرامت بخاری
نعمان صدیقی
سجاد حسن ترمذی
مظفر بخاری
بیدل پانی پتی
مسعود احمد [illegible]

# شہناز مزمل

شہناز مزمل کی ہمہ گیر شخصیت مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہی۔ کافی وقت ہم نے ایک ساتھ گزارا۔ ان کا انتھک محنت کرنے کا انداز، منظم طرز زندگی، جمالیاتی ذوق ہمیشہ میرے لئے مشعل راہ رہا ہے۔ گھر ہو یا دفتر یا لباس ہر چیز میں قرینہ، سلیقہ، حسن جمال نظر آتا ہے۔ ممتا کی اس جیتی جاگتی تصویر کو خدا نے زبان میں بھی وہ چاشنی عطا فرمائی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ وہ باتیں کرتی رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ بے پناہ مصروف رہنے کے باوجود چہرے کے شگفتگی برقرار ہے شاید ان کے اندر جو ایک پاکیزہ مخلص ایماندار اور صاحب ایمان عورت موجود ہے۔ اس کی جھلک ہمہ وقت ان کے چہرے پر جھلکتی نظر آتی ہے حیرانی پھر کچھ اور بڑھ جاتی ہے جب یہ ہردم ہشاش بشاش اور پرسکون نظر آنے والی دو بچیوں کی ماں بچیوں کے ساتھ تعلیمی مراحل طے کرتی نظر آتی ہیں اور آج بفضل تعالیٰ وہ جس مقام پر ہیں اس میں ان کے شوہر سلطان احمد اور بچوں کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے کہ انہوں نے ان کو خود کو دریافت کر کے کھوج نکالنے کے عمل میں ان کی بھرپور مدد کی ان کے تعاون سے انہوں نے نہ صرف تعلیمی مراحل طے کئے بلکہ علمی وادبی ثقافتی مذہبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاید یہ طمانیت ان کے اسی گھریلو خوشگوار ماحول کی رہین منت ہے۔

ان کے متعلق معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ خوشگوار حیرتوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ شادی کے وقت صرف ایف اے کیا تھا اب ۱۹۸۴ء میں ایم اے کیا بلکہ چار سالہ D.H.M.S بہت سی کمپیوٹر کورسز مختلف زبانوں کے کورس بھی کر چکی ہیں۔ اب بھی کبھی ایم فل اور کبھی پی ایچ ڈی کے لئے پر تولتی نظر آتی ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز کیا اور ۱۹۹۵ء تک بفضل تعالیٰ بارہ کتابیں منظر علم پر آچکی ہیں۔ جس میں سات شعری مجموعے اور پانچ نثری کتب شامل ہیں۔

ایک بڑی لائبریری کی منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر، ایک نامور شاعرہ، ادیبہ، مترجم (اردو، پنجابی، انگریزی، سرائیکی) بہت سی فلاحی تنظیموں کی رکن، ادبی تنظیم "ادب سرائے" کی چیئرپرسن لائبریوں کی مختلف تنظیموں کی فعال رکن پی ایل نیوز لیٹر کی سب ایڈیٹر کئی رسائل کی اعزازی معاون ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری کے متعلق ملک کے نامور دانشوروں، ادیبوں اور شعراء کے مضامین مقامی مختلف ادبی اور بین الاقوامی جرائد و رسائل میں چھپتے رہتے ہیں ان تمام یادداشتوں کا ریکارڈ انہوں نے جس حسن و خوبصورتی اور قرینے کے ساتھ رکھا ہے، وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔

ایک مداح ہونے کے ناطے "جرات اظہار" سے موم کے سائبان تک کے ادبی سفر کا عکس "عکس خیال" کی شکل میں پیش خدمت ہے۔ تازہ مجموعہ کلام ادھورے خواب چونکہ اس کے ساتھ ہی شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق مضامین اور آراء انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں آپ کی آراء کی منتظر رہوں گی۔

نعمانہ فاروق

کوئٹہ

یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء

# ابتدائیہ

کامیابی ایک ایسا عمل ہے جس کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ کچھ افراد ہوتے ہیں۔ ان کی کوششیں ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کا فکر انگیز عمل ہوتا ہے کہ جو ہر دن کے ہر لمحے کو ایک باب بنانے میں بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیابی کسی فرد واحد کی ہو یا تنظیم کی تحریک کی ہو یا قوم کی تاریخ کی کتاب کے چند باب ہمیں مستقبل کی پیشگوئی کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ادب سرائے اپنی مختصر تاریخ کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ایک صاف ستھری بے لاگ سی ادبی تنظیم جو لوگوں کو ادب اور اچھا ادب دینے کے مقصد کے تحت مصروف عمل ہے۔ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کی کامیابیوں کے پیچھے کچھ ہمہ جہت شخصیتیں ہیں جو ادب کے فروغ کے لئے نہ صرف خود مصروف عمل ہیں بلکہ لوگوں کو بھی ترغیب عمل کے لئے بھی کوشاں ہیں۔

شہناز مزمل ادب سرائے کی روح رواں ہیں۔ ادب سرائے کی چیئرپرسن ایک معروف شاعرہ ادیبہ اور کئی کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر ایک ذمہ دار سرکاری افسر ماڈل ٹاؤن لائبریری کی انچارج ہیں۔

عورت صنف نازک ہے اور گھر کی چار دیواری میں بھی اس کے بہت سے نازک پہلو اس کے بہت سے کاموں میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ تب یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ چار دیواری میں رہ کر بھی بہت کچھ نہیں کر سکتی۔ مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمہ جہتی اگر کسی عورت کی شخصیت کا مثبت پہلو بن جائے تو وہ مردوں سے آگے نکل جاتی ہے بلکہ اس کی نسوانیت کو حسین چاند لگ جاتے ہیں اور وہ فتح مند بن کر کائنات کے سامنے لوگوں کی آنکھیں چکا چوند کر ڈالتی ہے۔

دھیما پن' شائستگی' خلوص' مٹھاس' محبت' شفقت' سلیقہ' نظم و نسق' بے لوث پن اور وفاشعاری تو عورت کے خواص ہیں ہی۔ مگر غور و فکر' پر اعتمادی' دانشوری' عمل پیہم' لگن اور جذبہ پرواز' علم و آگہی جیسی اضافی خوبیوں کے ساتھ شہناز مزمل منظر عام پر ایک نامور اور معتبر نام ہے۔

انسان میں بہت سی ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو پہلی نظر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں جب شہناز مزمل سے ملی تو پہلی ہی نظر میں یہ تمام اوصاف میرے سامنے آئے بلکہ یہ شخصیت اس قدر موثر کن نظر آئی کہ مزید جانے بغیر نہ رہ سکی۔ کوئی کشش تھی کہ دوست بنتی گئی اور شہناز کی شخصیت کے دوسرے پہلو سامنے آتے گئے۔ شہناز کو آفیسر کی حیثیت سے دفتر میں بیٹھے دیکھا تو الگ حسن تھا۔ گھر دار عورت' ماں اور بیوی کی حیثیت سے مکمل ذمہ دار اور جب کتابوں کو پڑھا تو علمی قابلیتوں کے ساتھ ساتھ شہناز ایک منفرد مگر پر اعتماد طریقے سے اپنے تمام تر نازک حسی' جذباتی اور روحانی تجربوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس کی زندگی کا کونسا پہلو ہے جس میں سلیقہ نہیں۔ نظم و نسق' سکون اور تحمل نہیں۔ لائبریری

لائبریری کا ماحول ادب سرائے کے اجلاسوں اور تقریبات کا انعقاد ہر جگہ ایک قرینہ اور سکون ہے۔ ان کے حلقے میں مہذب' صاف ستھرے اور شائستہ لوگ ہیں۔ اس کا گھر اور لائبریری اور تنظیم

صاف ہے شیشے کی طرح۔ ان کی گفتگو، کردار اور تحریر شائستہ، مہذب اور باحیا ہے۔

دوستی کے کسی ایک دن مجھے شہناز مزمل کی ادب البم دیکھنے کا موقع ملا تو تربیت نظم و نسق اور سلیقے کی مزید پرتیں کھلتی گئیں۔ شہناز نے اپنے ادبی سفر کی کامیابیوں کی تاریخ بھی ایک سلیقے سے مرتب کی ہوئی ہے۔ مجھے کہ شہناز ہر عورت اور ہر مرد کو اس سلیقے اور نظم و نسق کا پیغام دینا چاہتی ہیں۔ یہ البم انہوں نے خود مجھے بڑے پیار سے دکھائی اور کہا کہ تم بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہو۔ میں نے ایک ایک صفحہ دیکھا اور سیکھنے کے عمل کو اپنے اندر سموتی رہی۔ اس لمحے مجھے شہناز ایک استاد کی حیثیت سے نظر آئیں۔

اپنے معاونین کا ہر بار ہر جگہ پر کھلے دل سے ذکر کرتیں کہ کس کس نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ اپنی ٹیم کے تمام ارکان کے نام لیتیں۔ مثلاً اس البم کی تیاری میں وہ حمیرا رشید کی ممنون تھیں۔

شہناز میں افسرانہ تحکم، تعصب اور عہدے کا زعم نہیں۔ ادب سرائے میں نووارد کی حیثیت سے آئی تو اس کا بذات خود مجھے تجربہ ہوا کہ کس طرح وہ نہ صرف دوستوں بلکہ غیر دوستوں پر بھی مہربان ہیں اور ان پر بھی جو نئے ہیں۔ ان کے لئے مجلس تلمذ کھولے ہوئے ہیں۔ ہر نئے لکھنے والے کی رہنمائی، حوصلہ افزائی بڑے دل کا کام ہے۔ شہناز کی وسعت القلبی کا تجربہ خود مجھے بھی ہوا۔ دراصل وہ ادب کی خدمت کے لئے در نایاب ڈھونڈتی ہیں یہ ادب کے لئے ایک نیکی کا کام ہے۔ وہ ادب کے بڑے لوگوں کے لئے احترام اور عزت کے جذبات بھی رکھتی ہیں وہ ادب سرائے میں ان محترم شخصیات کو بڑے ادب اور احترام سے مدعو کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک وہ بہت سے نامور افراد کو مدعو کر کے تقریبات منعقد کرا چکی ہیں۔ وہ دراصل نئی اور پرانی ادبی نسل کو ہم آہنگ کر کے ادبی خدمات کا سلسلہ چلا رہی ہیں۔

تحریر اور شاعری کے حوالے سے ان کی شخصیت کا اجمالی پہلو یہ ہے کہ وہ موم کے سائبان تلے رہنے کا فن جانتی ہیں۔ حروف کو جذب کر کے جذبوں کا اظہار جانتی ہیں۔ بڑے نازک اوراکات اور احساسات کی مالک ہیں کہ عکس دیوار پر تصویریں بناتی ہیں۔ وہ ظاہری طور پر جہاں سرگرم عمل ہیں وہاں باطنی طور پر اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے اور پرواز کے لئے سرگرداں ہیں۔

1- ادب سرائے کے تحت ہمہ جہت ادبی شخصیات کے خصوصی نمبر نکالنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے تاکہ ادب سرائے کے علمی اور شخصی پس منظر کو دوسرے لوگوں سے روشناس کروایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کے لئے یہ سلسلہ دلچسپ ہو گا۔ انشاء اللہ اس سلسلہ میں پہلا خصوصی نمبر شہناز مزمل صاحبہ کا ہے۔

2- اس کتاب کے شہناز خصوصی نمبر نکالنے کی تحریک دراصل شہناز کی وہ ادبی البم ہے جو انہوں نے 1989ء سے لے کر 1994ء تک ترتیب دی ہے اس نمبر میں ان کی مکمل ادبی سفر کا خاکہ اور شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سب سے پہلے ہم شکر گزار ہیں شہناز مزمل صاحبہ کے کہ انہوں نے اجازت دی۔ پھر میرا رشید کے ممنون ہیں کہ انہوں نے بھرپور تعاون کیا اور جس خلوص و محبت سے البم تیار کی اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی شکر گزار ہیں طارق محمود احسن صاحب کے جو اشاعتی مراحل میں معاون و مددگار رہے۔ خصوصاً نعمانہ فاروق کے جنہوں نے اس کو مرتب کیا اور "عکس خیال" کے نام سے ان یادداشتوں کو کتابی شکل دی۔

یادداشتوں کو محفوظ کرنے کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اگر آپ کے پاس بھی اس قسم کا کوئی ریکارڈ موجود ہے تو پہچان پبلی کیشنز کو بھجوائیں ادارہ اس کو کتابی شکل دینے میں فخر محسوس کرے گا۔

صادقہ نصیر



# شہناز مزمل کا تخلیقی سفر اور موم کے سائبان

حسن عسکری کاظمی

شعری تخلیق کا مرحلہ سلگتے آنسوؤں اور لرزیدہ قلم کے درمیان کہیں اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی حرف تمنا کا نم آلودہ چہرہ شاعر کی نظروں کے سامنے ایک نومیدہ پھول کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔ شاعری کا ہنر اور کمال حسن کی سوغات کبھی یکجا ہو جائیں تو وقت اپنے دامن میں ان دونوں اوصاف کو ابدیت سے ہمکنار کرنے کی خاطر مہر تصدیق ثبت کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسی شاعری جس میں ادھورے خواب، تتلیوں کے پر اور بے نام کسک رعنائی خیال کے تعارف میں صرف ہوں اور جس میں اپنے ناآسودہ تمناؤں کو لفظوں کے پیرہن میں تحائف کے طور پر پیش کئے جائیں وہاں خوشبو کا بدن ڈھونڈنے کی معصوم سی خواہش کا پیدا ہونا باعث تعجب نہیں ہوتا۔ اس وقت شعری تخلیق اور خود کلامی شدت درد کو کم کرنے میں زخم محبت کا مرہم بن جاتی ہے۔

موم کے سائبان کی متنوع اور ہمہ جہت رنگا رنگی دیکھتے ہوئے شہناز مزمل کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شائستگی اور قرینہ حسین امتزاج کے ساتھ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور شگفتہ انداز اظہار اس بات کی علامت ہے کہ ان کی تربیت ایسے ادبی ماحول میں ہوئی جہاں سچائی ایک قدر اور محبت کا پاکیزہ جذبہ حرف صداقت کی طرح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری تصنع سے پاک اعلیٰ انسانی رویوں کی آئینہ دار ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد نظم ہو یا غزل کا پیرایہ اظہار ان کا شعری اسلوب تہذیبی سانچے میں ڈھلا ہوا اور خوبصورت نیلگوں آسمان کی کی طرح شفاف اور دھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری ارضی حوالوں سے عبارت ہے اس کے باوجود وہ انسانی سطح پر ان ابدی صداقتوں کی علمبردار ہے جن کے بغیر ترسیل حرف و سخن ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں وہ زرد موسموں کے عذاب سہتے ہوئے تیشہ کرب کے ہاتھوں زخم خوردہ روح کی مسیحائی کے لئے مرہم کی جستجو میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں وہ اپنے ادھورے خوابوں کے ساتھ لاحاصلی کی سرزمین پر ثابت قدمی کے ساتھ رواں دواں ہیں اور یہی سچائی غزل کی تنگ نائے یا نظم کے کھلے سمندروں میں ان کے وارد ہونے کی خبر دیتی ہے۔ وہ سفر زیست میں ہر قدم آگے بڑھتے رہنے اور ادھورے سپنوں کی خلش کو تقدیر کا لکھا جان کر صدیوں کے رتجگوں سے ایک حد تک فرار کی طلب گار بھی ہیں اس کے باوصف وہ اپنی ذات کو دو لخت ہوتے دیکھ کر خود کلامی کے انداز میں غزل کے ایجاز و انتصار کو وسعت آشنا بنا دیتی ہیں۔

مری طرح سے کہیں خاک چھانتا ہو گا
وہ اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا ہو گا
جو میری جھیل سی آنکھوں میں ڈوب گیا

ڈھونڈتا

بدلتی رت میں وہ کیسا بدل گیا شہناز
بچھڑ کے مجھ سے کبھی وہ بھی سوچتا ہو گا

شہناز مزمل کے اسلوب اظہار کا صرف ایک رخ پیش کرتا اور غزل سے ہٹ کر یہ ثابت کرنا کہ وہ محض نظم کی شاعرہ ہیں کسی طور درست نہیں۔ وہ یقیناً آزاد نظم میں اپنی انفرادیت کا پرچم اٹھائے اور تخلیقی قوت سے کام لیتے ہوئے صف اول میں جگہ بنانے کی خاطر پر عزم دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی خوبصورت آزاد نظموں میں رت جگوں کی مسافت' لاحاصلی کی سرزمین' زرد موسم کا عذاب' کربلا کے نام' دائروں کے درمیان بنتا شہراور آنچ سے پگھلتی برف ایک حد تک علامتی ضرور ہیں لیکن ترسیل فکر کے تقاضوں پر پوری طرح منطبق ہیں اسی طرح موم کے سائبان احساس کی زنجیر حسرتوں کی قتل گاہ اور خموشی جان لیوا ہوگی۔ ایسی کامیاب اور سدا بہار نظمیں ہیں جو شعور کی دہلیز پر نئے امکانات کی روشنی بکھیر رہی ہیں۔ وہی کرب مسلسل کی دھیمی آنچ' وہی ناتمام آرزوؤں کی تپش اور وہی سلگتی آنکھوں میں ادھورے خوابوں کا سلسلہ۔ ان کی ہر نظم ہمارے گردو پیش کی سچائیوں کا آئینہ ہے جس میں مشرقی روایت کا رکھ رکھاؤ اور صنف نازک کی ذات سے وابستہ وہ مسائل ہیں جنہیں شاید مستقبل میں حل ہونا مقدر ہے۔

آئینہ دل کا چٹختا ہے بکھر جاتا ہے
کوئی آواز مگر اس کی نہیں سن سکتا
کرچیاں دل کی فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں
سسکیاں میری ترنم میں بدل جاتی ہیں
دل کے میلے سے نکل کر شب تنہائی میں
کتنا دشوار ہے یوں خود کو سنبھالے رکھنا
سوچتی ہوں کہ وہی میں ہوں وہی دنیا ہے
ہے سبھی کچھ تو وہی دن کے اجالوں کے سوا

شہناز مزمل کے تخیل کے وسیع کینوس پر بھیگی شامیں' اڑتے بادل' سوندھی خوشبو' جیون ساگر' مسافت کی ردا' نیم خوابیدہ صداؤں سے چھلکتے الفاظ' دریدہ ہاتھ' دھند میں لپٹی فضائیں' شب تاریک میں سویا ہوا چاند نظر آتا ہے اور کہیں تتلیاں' جھیل' سمندر اور کوہسار آنکھ کی پتلی میں اتر آتے ہیں۔ ان سب کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ شعر کہنے کی بجائے کسی نادیدہ منظر کی تصویر پردہ تصور پر اتارنے کیلئے موئے قلم کو رنگوں میں ڈبو دینا چاہتی ہیں۔ ان کی بے قرار اور مضطرب روح میں کلبلاتی خواہشوں کی پرچھائیاں کبھی ایک دوسرے سے جدا اور کبھی ایک دوسرے میں آوازوں کے رنگین تانے بانوں کی طرح یکجان ہو جاتی ہیں۔

میں سوچتی ہوں سراب ہے سب
یہ آگہی بھی عذاب ہے اب

تمھیں بتاؤں نا کیا کروں میں
اگر میں آنکھوں کو بند کر لوں
کوئی بھی آواز سن نہ پاؤں
مگر یہ آنکھیں جو میرے اندر چمک رہی ہیں
میں سو بھی جاؤں
یہ جاگتی ہیں!

(بے کلی)

شہناز مزمل کا اپنے شعری سفر سے متعلق یہ کہنا بجا ہے کہ حوصلہ افزائی ہوئی تو جذبوں نے حرف پہنچے اور جذب و حروف کا پیکر سامنے آیا تو پھر جرات اظہار کا قرینہ بھی آ گیا اور یوں جذب و حروف اور جرات اظہار ساتھ ساتھ منظر عام پر آئیں۔ پھر "میرا خواب ادھورا ہے" کو پورا کرنے کے لئے رتجگوں کی مسافت بھی کاٹی۔ سفر خود آگہی اور جرم آگہی کے کرب سے بھی گزری۔ کسک اور بے کلی بڑھتی گئی، برزخ احساس میں جلتی رہی لیکن خواہش نادیدہ کے ساتھ ساتھ لاحاصلی کی سرزمین پر چلتی ہوئی مختلف زاویے بناتی رہی مگر ادھورا خواب پورا نہ ہوا۔

شہناز مزمل کا تخلیقی سفر اپنے منفرد شعری اسلوب کے ساتھ جاری ہے جس پر کسی کی چھاپ نہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا سرچشمہ خود ان کی ذات کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ شہناز مزمل اسی عہد موجود کے معاشرے کی فرد ہیں۔ اس لئے ان کے درد و کرب کا رشتہ ہماری دھرتی کے نظام سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا نسائی وجود معاشرے کے روایتی جبر اور مستقبل کے روشن امکان کی نمائندگی سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری میں سلگتے مشتعل جذبوں کا جو بکاؤ جبر و استحصال سے ٹکراؤ کے باوجود کسک اور احساس محرومی کی نشاندہی کرتا ہے۔

خواب تو خواب ہیں بنتے ہیں بکھر جاتے ہیں
نقش رہ جاتے ہیں اور نقش ادھورے شہناز
جان کا روگ چبھن روح کی بن جاتے ہیں
میرے دل میں کسی گزرے ہوئے لمحے کی کسک
جانے کیوں آنکھ کی پتلی میں اتر آئی ہے

(کسک)

بعض احباب نے شہناز مزمل کو نظم کی شاعرہ سمجھا اور جانا ہے۔ان کا یہ کہنا کہ "شہناز مزمل کے ہاں غزل بھی اچھی ہے مگر اس پر نظم کا رنگ غالب ہے۔ اسے نظم کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا"۔ اگر اس رائے کو درست مان لیا جائے تو غزل کے حوالے سے ان کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی جب کہ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ ترازو کے دو پلڑوں میں نظم و غزل کا سرمایہ رکھنا پسند کریں تو مواد کے اعتبار سے نظم کا پلڑا ضرور جھکا ہو گا لیکن غزل کی ایمائیت ' روایت سے بغاوت ' جدت طرازی ' نئے امکانات ' منفرد اسلوب ' نئے تلازمی اور ریزہ خیالی کی نئی شکلیں دیکھنا مقصود ہوں تو ان کا دوسرا پلڑا کہیں زیادہ وزنی دکھائی دے گا۔ خیر یہ تو زاویہ نظر کا فرق ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وہ بحیثیت غزل گو ایک توانا اور منفرد لہجے کی شاعرہ ہیں۔ان کے ہاں غزل میں روایت سے وابستگی اپنی جگہ لیکن نئے تقاضوں کا لحاظ رکھنا اس سے بھی کہیں زیادہ قابل اعتبار نظر آیا۔

خواہشوں کے پھیلنے سے قربتیں کم ہو گئیں کم
گھر تو بن پائے نہیں خالی مکان بنتے گئے

جہاں سنگ ریزے ہیں ہاتھوں میں سب کے
وہیں کانچ کا میں مکاں ڈھونڈتی ہوں۔

مری آنکھیں سمندر ہو گئی ہیں
میں سورج بن کے جلتی جا رہی ہوں

مجھے بھی کچا گھڑا ملا ہے
اترنا دریا کے پار چاہوں

چاندنی زرد ہے وحشت ہے فضا میں شہناز
کون ٹھہرے گا یہاں شہر ہے ویراں جاناں

عہد موجود میں یہ بات طے ہو چکی کہ غزل کہنے کا روایتی انداز چھوڑ کر کسی شاعرہ کے لئے صیغہ تانیث برتنا فطری عمل ہے۔ ہمارے عہد کی شاعرات نے اس طلسم کو توڑ کر اچھا کیا۔ یوں بھی غزل کو نیم

وحشی صنف سخن قرار دینا قصہ ماضی ہو چکا ہے۔ جدید غزل نے عوام و خواص سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا ہے۔ غزل کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی کو خوبصورتی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنے وجود میں سمو رہی ہے۔ کائنات کے ہر رخ کو آئینہ دکھانا غزل کا مقدر ٹھہرا ہے اسی طرح انسان کے اندر جو کائنات آباد ہے اور محشر خیال کی رست خیزی موجود ہے اسے باہر کی دنیا میں متعارف کروانے میں غزل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ گویا داخلی اور خارجی دنیاؤں کو غزل نے سر کیا ہوا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو غزل کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آج کا غزل گو ظاہر و باطن کی کشمکش اور اپنی شخصیت کے نادیدہ جزیروں کا بے کراں حسن سمیٹ کر غزل کا موضوع تراش لیتا ہے۔ اسے داخلیت سے خارجیت اور کبھی خارجیت سے داخلیت کا سفر درپیش ہوتا ہے۔ شہناز مزمل نے بھی اسی لذت سفر میں ایک عرصہ گزار دیا بلکہ یوں کہا جائے کہ اس ذوق سفر کی خاطر ادھورے خوابوں اور رتجگوں کا عذاب سر پر اٹھائے ابھی تک تخلیقی عمل سے دوچار ہیں۔ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اپنی ذات کے حوالے سے اجتماعی زندگی میں درپیش مشکلات اور انہیں سر کرنے کا حوصلہ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جسے غزل میں سمونے کی خاطر خوبصورت اور عام فہم استعارے وضع کرنا شہناز مزمل کی پہچان ہی نہیں ان کی منفرد آواز کی شناخت بھی ہے۔

آبلہ پا زندگی کو یوں بسر کرتے رہے
خار چن کر راستوں کو رہ گزر کرتے رہے
راستہ اپنا زمیں سے ہو سکا کب استوار
اک خلائے بیکراں میں ہم سفر کرتے رہے

شہناز مزمل ایک ایسی تخلیق کار ہیں جو روایت اور جدت کے سنگھم پر خود کلامی کے انداز میں آگے بڑھنے کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ وہ روایت سے بے تعلق ہو کر یا روایت کا پابند ہو کر غزل کہنے کے مخمصے میں مبتلا نہیں ہوتیں بلکہ اپنے سچے اور کھرے جذبوں کے اظہار کو ترجیح دینا پسند کرتی ہیں۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تشنہ لبی' بیتے موسموں کے زخم اور شکستہ آئینہ خانے جیسے استعارے اپنی ذات سے بڑھ کر علامت طرازی کے امکانات کی خبر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی مسائل کا تجزیہ کرنے میں رموز و علائم سے کام لینے کا ہنر شہناز مزمل کا کمال فن ہے۔ وہ غزل میں مطالعہ ذات' انسانی بطون کی ناہمواری' مثبت اور منفی رویوں' ضبط نفس کے مظاہر اور فکر و نظر کے ان گنت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی خاطر محسوسات کی دنیا سے تعلق رکھنے والے عناصر اور حواس خمسہ کی دسترس میں آجانے والے عوامل سے تفہیم کے مراحل آسانی سے طے کرنا جانتی ہیں۔ یہی وہ شاعرانہ فنکاری ہے جسے برتنا ان کا وصف خاص ہے۔

میں ازل سے ہوں تشنہ لب لیکن
ساتھ اس کے بھی ایک صحرا ہے

گا

بیتے موسم کا زخم گہرا ہے

شکستہ آئینہ خانوں میں عکس کس کا ہے
یہ راز کیسے کھلے انکشاف کیسے ہو

تمام عمر گریزاں رہے زمانے سے
یہ جرم اپنی انا کا کیسے معاف ہو

بس اپنی ذات کا رکھنا بھرم بہر صورت
کسی کو یاد دل بے قرار مت کرنا

کھلے دریچوں پہ دستک ہوا نہیں دیتی
سماعتوں پہ کبھی اعتبار مت کرنا

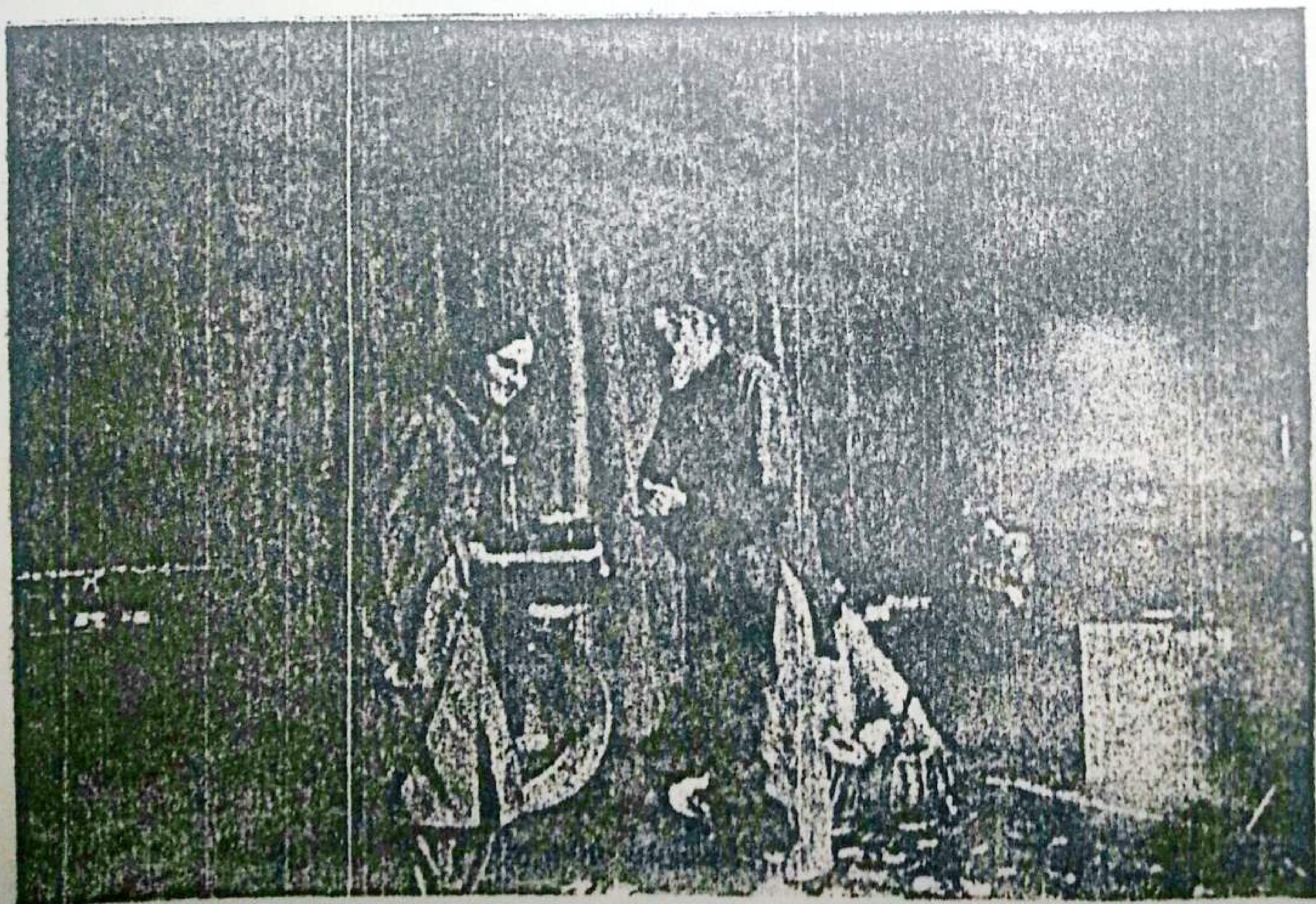
معاشرتی رویوں میں نفاق اور فکر و عمل کے تضاد سے غزل کو خوبصورت موضوعات ہاتھ لگے ہیں۔ ہمارے شعراء نے انسانی سطح پر بہت کچھ دیکھا۔ اہل خرد کی عیاری اور زمانہ ساز لوگوں کی مکاری سے احترام آدمیت کو جو ضعف پہنچا وہ ناقابل تلافی جرم ہے۔ اسی منفی رویے کو بلاواسطہ یا بالواسطہ پیش کرنا غزل کی خوبصورت اور مضبوط روایت کا حصہ ہے۔ شہناز مزمل نے کم بہت کم اس فکری تضاد کو بلاواسطہ پیش کیا۔ البتہ ان کی شخصیت پر اس منفی رویے سے پیدا ہونے والے اثرات جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔

زمانہ سازوں کے تیز تیشوں سے آئینے دل کے ٹوٹتے ہیں
فضا میں پھیلی ہیں سسکیاں تو ہوا یہ بیزار کس لئے ہے
مٹا دو سارے نشاں خزاں کے نوید صبح بہار دے دو
سب آبلہ پا گزر چکے ہیں یہ راہ پر خار کس لئے ہے
سفینے جو بچ گئے بھنور سے اتاریں ساحل پہ یا ڈبو دیں
یہ آج طوفاں میں ناخدا میں عجب سی تکرار کس لئے ہے
سماعتوں پہ ہیں دستکیں سی یہ کون مجھ کو بلا رہا ہے

میرے ہی رستے میں سازشوں کی کھڑی یہ دیوار کس لئے ہے

وہ اپنی ذات اور اس حوالے سے معاشرتی رویوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے غزل اور نظم دونوں میں اپنے مخصوص انداز نظر سے کام لینا اچھی طرح جانتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں خود پسندی کی سرحد پر اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہو یا وہ لذت آزار میں مبتلا ہو کر منزل جاناں سے بے رخی کو اپنا شعار بنا لیتیں مگر یہ بھی اعجاز تربیت ہے کہ وہ معصوم اور پاکیزہ جذبہ محبت کی مہکتی فضا میں تزکیہ ذات کا مرحلہ بخیرو خوبی طے کر گئیں۔ وہ موم کے سائباں کی تخلیق میں اپنے وجود کو پگھلتے محسوس کرتی رہیں مگر خود پسندی سے کوسوں دور ہونے کے باعث وہ نشۂ اظہار میں سرخوشی سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ انہیں اپنی ہی جستجو میں ناکامی کا ملال ضرور ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر محبت کے سمندر کی پیاس کی طرح طلب میں مبتلا ہے۔ ان کے دست ہنر پر رکھے ہوئے ادھورے خواب تعبیر نا آشنا ہیں۔ وہ قربت جاناں کی آرزو اور تمنا کی زرد چاندنی کے زخم کی ناتمامی کے ہاتھوں افسردہ خاطر ہو کر بھی موم کے سائبان کو رگ جاں سے جاذب نظر بنا چکی ہیں جبکہ بہت سے دشت امکان ان کے منتظر ہیں۔

میں اپنی ذات کے اندھے خلاؤں میں گم ہوں
میرا وجود ابھی میری دسترس میں نہیں
محبتوں کے سمندر کی پیاس کیا بجھتی
نصیب قربت جاناں تو اس برس میں نہیں



# بالغ نظر شاعرہ

ڈاکٹر آغا سہیل

ٹیگور کی رومانی شاعری کی روایت کو اختر شیرانی نے اردو شاعری میں جس طرح داخل کیا ہر چند کہ وہ تقلیدی سے زیادہ تخلیقی تھی لیکن مغرب کے رومانی شعراء کے تتبع میں جو اردو شعر و ادب میں بھونڈی بازگشت ہوئی اس کے پاؤں زمین پر قائم نہیں تھے کہ جذبِ خیال اور وجدان کی ماورائیت نے اولاً" حیرت اور استعجاب کے موضوعات کو اپنایا بعدہ تحیر کی نشاۃ الثانیہ سے خوش فعلیاں ہوتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تقلیدی صورت حال سے اردو کے نوخیز اور ٹین ایجرز تو خوش ہوئے لیکن بالغ نظر قارئین جو تفکر و تعقل کی ارضیت پر پاؤں ٹکا کر چلتے تھے مایوس ہوئے۔ یوں تو غالب نے عصری حسیت میں فکر اور عقل سے متخیلہ کو توانا بنایا لیکن فیض نے بیسویں صدی میں رومانیت سے گریز کر کے ترقی پسند شعراء کو راستہ دکھایا۔ اسی شعری روایت سے اردو شاعری کو توانائی ملی اور اس کی بے سمتی ختم ہوئی۔ موم کے سائبان کی شاعرہ شہناز مزمل نے جس شعری روایت کو اپنایا ہے وہ ایک بالغ نظر شاعرہ کی عصری حسیت کی توانا مستحکم اور منطقی گواہی ہے جو نہ تو مطلقاً" تقلیدی ہے اور نہ جذباتی بلکہ صحت مند اقدار حیات پر برسوں غور و فکر کے نتیجے میں جو مبلغ علم سوجھ بوجھ اور شعور پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ اور حاصل ہے۔ خوبی یہ ہے کہ شہناز نے اس کے فطری اظہار کا اپنا ذاتی اسلوب خود ایجاد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب شعر نادر متنوع اور جاذب توجہ ہے۔ جو مسلسل نمو اور ارتقاء کا پتہ دے رہا ہے۔

# علامتوں کے آبگینے

## یونس جاوید

شہناز مزمل کی شاعری، فرد کی آسودگی سے مظلوم آبادیوں اور محکوم بستیوں کے باسیوں کے ٹوٹے خوابوں تک کی عکاسی ہے۔ یہ مظلوم و محکوم باسی ہو آزاد ملک میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہیں اور ان کے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں ایک بڑے کینوس پر بکھری ہوئی ہیں۔

خواب دیکھنے اور خوابوں کے ٹوٹنے کا عمل ہی شہناز مزمل کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوابوں کا یہ سلسلہ رومان افزا نمی میں گندھ کر نئے حوالوں سے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ امید افزا گلابوں کی کیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ "موم کے سائبان" کی شاعری ان گلاب آمیز کیاریوں کی شہادت ہے۔

ذات کا کرب ہو، ذات کی قید ہو یا بند گلی کا بندھن، شہناز کے ہاں زندگی گزارنے کی خواہش کہیں بھی دم توڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ محرومی، بے بسی اور فرار کے جلتے لمحوں نے اسے عذاب سہنے کا حوصلہ دیا ہے اور یہ ہر حساس اور باشعور کے لئے ضروری بھی ہے۔ حساس ہونا ہی باشعور ہونا ہے اور یہی عذاب سہنا اور پل پراط سے گزرنے کی کامرانی ہی شعر کی سلطنت پر حکمرانی ہے۔ جس کے لئے شہناز اپنی پوری توانائیوں سے بر سرپیکار ہیں۔

درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

مجھے لگتا ہے کہ جیسے شہناز شاعری نہیں کرتیں نازک ترین آبگینوں میں مہک اتارتی ہیں۔ یہ آبگینے علامتوں سے ابھرے ہیں اور علامتیں یوں اس کی شاعری کو سینچ رہی ہیں جیسے خود شاعر اپنے آپ کو شعر میں سمو کر توسیع ذات کر رہا ہو۔

اظہار ذات سے توسیع ذات تک کا یہ سفر ایک مضبوط شاعرہ کی تادیر سنائی دینے والی نغمہ سرائی کی نوید بھی ہے اور تراشیدہ تصورات کا شیش محل بھی۔ کہ جس سے دیکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو جلا ملتی رہے گی۔

# میری نظر میں

عذرا اصغر

تخلیق کا جذبہ انسانی فطرت ہے۔ انسان خالق کائنات کا ایک ادنی سا پر تو ہے۔ انسان میں تخلیقی جوہر اس کی عطا ہے جس نے اسے تخلیق کیا۔
اس مہربان رب کا شکر!

جو لوگ بظاہر کچھ نہیں کر رہے ہوتے۔ تخلیقی ایسے کام جنہیں عرف عام میں مصوری، شاعری، نثر کی کسی بھی صنف کی صورت پذیری یا گلوکاری وغیرہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک وہ بھی کچھ نہ کچھ کر رہے ہوتے ہیں مگر انکے جوہر عام نظر سے بوجوہ پوشیدہ رہتے ہیں کیونکہ اظہار ذات کیلئے کسی نہ کسی پلیٹ فارم کا ہونا ضروری ہوتا ہے

میں نہیں مانتی کہ کوئی بھی ذی روح جذبہ تخلیق سے یا کچھ کرنے کی خواہش سے عاری ہے یہ ہو سکتا ہے کہ ناساز گار ماحول احساس کی شدت کو کم کر دے۔ اس چنگاری کو بھوبھل تلے دبا دے۔ اور لمبے عرصے تک موقع نہ ملنے کے سبب وہ جذبہ احساس نکاس کی راہ نہ پاکر فنا کی جانب گامزن ہو جائے اگر ایسا لگتا ہے، اصل میں کوئی جذبہ یا کسی کام کی لگن مرتی کبھی نہیں۔ احساسات نکاس اظہار نہ پاکر سو جاتے ہیں۔ یا انسان بہ امر مصلحت ایسا کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ پھر جیسے ہی راستہ ہموار ملتا ہے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنہیں ہنر ذات کے برتنے کا بروقت وسیلہ مل جاتا ہے۔
شہناز مزمل ایسے ہی خوش نصیب افراد میں شمار کی جا سکتی ہیں کہ جنہیں میں کہوں گی اظہار ذات کے ایک سے زیادہ وسیلے ملے اگرچہ کسی قدر تاخیر سے یہ وسائل میسر آئے لیکن دیر آید درست آید کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔ وہ ایک ذہین اور پر عزم خاتون ہیں۔ انہوں نے تھوڑے پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ فتح کرتی، پچھاڑتی، گراتی آگے بڑھنے کو پسند کرتی ہیں۔ شاعر مشرق نے ایسے ہی افراد کے لئے کہا تھا۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

شہناز مزمل نے اپنی فنی سفر کو اپنے عزم و ہمت سے آسان تر بنایا ہے وہ خود کہتی ہیں

میری فطرت نے دھنک رنگ کی چنری رنگ کر
پیراہن زیست کا رنگین بنا رکھا ہے!
رستہ دشوار ہے شہناز پہ اتنا بھی نہیں
جس قدر آپ نے سنگین بنا رکھا ہے!

پیشے کے اعتبار سے شہناز مزمل نے جس شعبے کا انتخاب کیا ہے، وہ بھی انکی کتاب دوستی کا مظہر

ہے وہ دن کا بیشتر وقت کتابوں کے نگر میں بسر کرتی ہیں۔ کتابوں کی گلیوں میں گھومتی ہیں۔ کتابوں سے ہمکلام ہوتی ہیں اور کتابیں تخلیق کرتی ہیں تھوڑے ہی وقت میں انہوں نے تصنیف و تالیف کے بہت سے مرحلے طے کر لئے ہیں۔

شہناز کو شعر و ادب کی بستی بسائے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی لیکن فن کی دیوی انکے قلم کی قلمرو میں آن براجی ہے

شہناز مزمل نے اپنے فنی سفر کا آغاز آزاد نظم سے کیا ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو مگر ان کا کلام پڑھتے ہوئے مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ ان کی پہلی کاوش "جذب و حروف" کے نام سے منظرعام پر آئی۔ پھر یکے بعد دیگرے تین چار مجموعہ کلام کی مصنفہ بنیں۔ "جرات اظہار" تک آتے آتے انہوں نے غزل کو وادی کو اپنا مسکن بنایا۔ مگر کسی جگہ رک جانا یا مستقل قیام کرنا اور ٹھہر ٹھہر کر چلنا ان کے مزاج کو راس نہیں۔ سو وہ آگے۔ اور آگے بڑھ رہی ہیں۔ لائبریری سائنس رقم کی کتابیں رقم کیں۔ صوم و صلوۃ جیسے اسلامی اصولوں کو بچوں کے لئے تالیف کیا۔ اپنے ہمعصر شعراء کے کلام کو انگریزی میں ترجمہ کروا کے Ten Poets of to day کے نام سے مرتب کیا اور اب جاپانی صنف سخن 'ہائیکو' کے صحن گلشن کی گشت پیمائی کر رہی ہیں۔ شہنا مزمل کی شاعری عصر حاضر اور قدم کے مروجہ اوصولوں اور قوائد و ضوابط سے پوری طرح ہم آہنگ ہے ان کے کلام میں پند و نصائح کے کے ساتھ اسلامی معاشرت کے تقاضے بدرجہ اتم ہیں۔ جبکہ ان کا مجموعہ کلام "جرات اظہار" کے عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں انہوں نے اپنے عہد کی بعض شاعرات کی پیروی میں عورت کے مخفی جذبوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہوگی۔ لیکن میری طرح قارئین بھی خوشگوار حیرت سے گذرے ہوں گے جب "جرات اظہار" میں انہیں اپنے خیال کے برعکس حب الوطنی' انسانی ہمدردی اور معاشرت اقدار کے تاثرات سے بھرپور شاعری پڑھنے کو ملی ہوگی۔

انکے ہاں وہی ان کے مزاج جیسا دھیما پن' محبت کا مدھم مدھم لطیف احساس کومل جذبوں کی نم نم ٹھنڈک ہے جو قاری کو یقین دلاتی ہے

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس اعتبار سے وہ اپنی ہمعصروں میں مختلف و منفرد ہیں کہ نہ ولولہ انگیز افلاطونی محبت کا اظہار اور نہ برانگیخت کر دینے والی جذبوں کو آنچ۔

سو شہناز بی بی! لفظ لفظ اور قدم قدم پر چونکا دینے والے زمانے میں تم جو گذری صدی کے جذبے عام کرنے چلی ہو۔ اس سے تمہیں کیا ملے گا؟ شہرت کے حصول کے لئے اور قد کو بڑھانے کے واسطے دوسرے طریقے استعمال کرنا پڑتے ہیں دوڑ کر ادب کے ہمالہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا ہے تو ایسی شاعری کرو جو مردوں کو انگشت بدندان کر دے اور جسے پڑھ کر عورتیں آنچلوں کو منہ پر ڈال لیں اور زیر لب مسکرائیں۔ تم ٹھہریں نرم خو' شائستہ مزاج' بے راہ روی کے کیچڑ میں لتھڑے اس معاشرے کو

نہلادھلا کر پاک صاف کرنے کی خواہاں' دنیا کو نیکی' پاکیزگی' محبت اور صلح جوئی کے زرین اصولوں سے محبت بنادینے کی آرزومند۔ یہ کام تم سے کہاں ہو سکے گا؟

مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ کوئی تو ایسا ہو جو سماجی اتھل پتھل کے اس دور میں اخلاق کے تاج محل کے گرتے ستونوں کو بڑھ کر تھام لے اور افراد کو ٹھوکر کھانے اور ملبے تلے دبنے سے بچا سکے۔

اپنے پانچویں مجموعہ کلام موم کے سائبان کے آنے تک شہناز مزمل کی گرفت فن پر مضبوط تر ہو گئی ہے اب ان کے ہاں "زرد موسم کے عذاب"۔ "کوچہ جاناں"۔ "جرم آگہی" اور "میری ہتھیلی پہ خواب دینا" جیسے احساسات نظر آتے ہیں۔ چھٹے شعری مجموعے "ادھورے خواب" میں اضطراب نار سا چھاؤں جلتی رہی۔ بندھے ہاتھوں کے زندہ لفظ بنجر ہوتی آنکھیں جیسے نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ تیز تھا اب وسعت پذیر ہے اپنی سادہ مزاجی کے ساتھ وہ دنیا کو سمجھنے کا ڈھنگ سیکھ رہی ہیں ان کی فکر دائرہ وسیع تر ہو رہا ہے۔ بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کا فنی سفرنئی زمینوں کی تلاش میں جاری رہے گا اور وہ اپنے خوابوں کی منزل جیتی جاگتی اس دنیا میں پالیں گی۔

عورت ہونے کے ناطے شہناز مزمل نے اپنے خانہ داری کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شعروادب کے چراغ جلا رکھے ہیں وہ اپنی محفل "ادب سرائے" میں نووردان ادب کی پذیرائی بڑے خلوص سے کرتی ہیں اور ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ سینئرز کو شفیق ماں کی طرح ہونا چاہئے یہاں شہناز خصوصیت کے ساتھ ممتا کے جذبے کو اپنے جونیئرز میں عام کرتی ہیں۔ اس سخت' جانگسل مرحلے سے گذرنے کا احساس کوئی ایسا ہی فرد کر سکتا ہے جو خود اس قسم کی کٹھنائیوں سے گزرا ہو یا گزر رہا ہوں۔ مجھے بہر طور اس امر کا ادراک ہے۔ مرد کی حاکمیت کے اس معاشرے میں کوئی عورت سربلند کرکے یہ اس کا اپنا حوصلہ ہے۔ انار کلیاں تو آج بھی دیواروں میں چنوادی جاتی ہیں۔

اسی سبب سے مجھے شہناز مزمل اچھی لگتی ہے کہ اس نے کسی مشکل کو اپنے لئے راہ دشوار نہیں بننے دیا۔ اور وہ اپنے راستے کے خار ہٹاتی۔ راہ کے پتھر چنتی آگے۔ اور آگے بڑھ رہی ہے۔ ابھی اسے بہت دور جانا ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکی راہوں کی مزید آسان کردے اور اس کے عزائم کو دوام بخشے۔ آمین

# موم کے سائباں پر ایک نظر

ثاقب رزمی

محترمہ شہناز مزمل شاعری کی وادی میں کافی مسافت طے کر چکی ہیں۔ ان کی شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور چھٹا مجموعہ "میرا خواب ادھورا ہے" طباعت کے مرحلے میں ہے۔ یہ ایک قابل ذکر حقیقت ہے کہ اردو ادب کے جدید تر دور میں ان کی شاعری معروضیت کی حامل اور ابہام سے ناآشنا ہے۔ وہ موجودہ عہد میں فرد کی الجھنوں اور معاشرے کے اہم مسائل کو شعریت کا لباس پہنا کر قاری کے سامنے لاتی ہیں۔

وہ اپنے حالیہ مجموعہ شاعری "موم کے سائبان" میں معاشرے کی بے حسی اور فرد کی تنہائی اور عدم تحفظ کو بیان کرتی ہیں کہ فرد کس طرح اپنے جرم آگہی کی بناء پر ایک عذاب پیہم میں مبتلا رہتا ہے۔ لیکن وہ آگہی کے سورج میں اپنے سفر کو جاری رکھنے کا عزم کرتی ہیں۔

میں اس کی قرمزی کرنوں کو خود میں قید کر لوں گی
میں خود جلنے لگوں گی
روشنی اس کی بکھیروں گی

شہناز مزمل موجودہ معاشرے کو لاحاصلی کی سرزمین قرار دیتی ہیں جس میں ہر جانب تیرگی ضرور پرافشاں ہے لیکن وہ یہ یقین رکھتی ہیں کہ روشنی کی کرن انسان کے اندرون سے پھوٹے گی۔ یہ تیرگی کوئی دوامی منظر نہیں۔ وہ اپنی نظم "کڑی سزا" میں ہبوط آدم کی کہانی کو نئے روپ میں پیش کرتی ہیں اور خدا سے گلہ کرتی ہیں کہ اس نے اسے جنت سے نکال کر اس دنیا میں کیوں بھیجا جہاں انسان کی زندگی کا کوئی محور متعین نہیں اور انسان ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے۔ جہاں کتنے شداد اور منصور ہیں اور معرکہ خیرو شر جاری ہے جہاں وہ محو حیرت ہے اور نت نئے گھروندے بناتا ہے جو سیلاب بلا کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح انسان ایک کربلائے ذلت میں قید ہے۔ وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہتی ہیں۔

کوئی خواب حسیں ہی بھیک میں مجھ کو کبھی دے دے
وگرنہ اے خدا یہ زندگی لے لے

شہناز مزمل بڑی صاحب تخیل شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم "مٹی" میں اس خیال کو سامنے رکھتے ہوئے کہ انسان مٹی سے بنا ہے اور آخر کار مٹی میں مٹی ہو جاتا ہے۔ مٹی کو کئی اشکال میں پیش کیا ہے۔ وہ خود مٹی کی ایک مورت ہے۔ انسان مٹی کو کوزوں، بتوں میں ڈھالتا ہے، اور مٹی ہی اس کی قبر بنتی ہے۔

وہ اپنا اضطراب مسلسل بیان کرتی ہیں اور زندگی کی تلخیوں، الجھنوں اور نفرتوں کو آگہی کا عذاب

بھی ہیں۔ لیکن وہ خواہشوں سے پناہ نہیں بھی ڈھونڈ نہیں پاتیں کہ زندگی تو خواہشوں کا ایک سمندر ہے جسے انہوں نے برزخ احساس کہا ہے۔ وہ گزرے ہوئے لمحوں یعنی ماضی کے آنگن میں کئی تمناؤں کو دم توڑتے ہوئے اور کئی بکھرتے خوابوں کی کرچیوں کو دیکھتی ہیں۔ یہ ماضی کا ایک دلکش تصور ہے۔

شہناز مزمل کی شاعری مسلسل تلاش اور جستجو کی شاعری ہے۔ وہ دنیا کو ایک پردیس سمجھتی ہیں جہاں فرد کے خاموش آنسوؤں اور کرب و درد کو معاشرہ کوئی اہمیت نہیں دیتا اور جہاں فرد کو جینے اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ وہ فرد کو شب گزیدہ قرار دیتی ہیں جس کے آزار، تنہائی اور احساس کو بہت کم سمجھا جاتا ہے۔ شب گزیدہ فرد کے لئے شب غم کو مسخر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظم "سرد سناٹا" میں گہری خاموشی سے گھبرا کر اپنی سوچ میں ہلچل اور اپنے رگ و پے میں تیز سرسراہٹ کی آرزو کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔

خدایا!

برف سوچوں کو میری پگھلا

نیا سوج جلا کر

میری یخ بستہ سوچوں کو روانی دے

میرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

ہم شاعرہ کو مسلسل اپنے آپ کی تلاش میں پاتے ہیں۔ اور وہ خود شناسی کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور اس ضمن میں بڑے گراں قدر اشعار کو پیکروں میں ڈھالتی ہیں۔

گزرے ہوئے لمحوں کی خلش آج مجھے کیوں
سوئی ہوئی تقدیس کا احساس دلا کر
تنہائی کے جنگل کی طرف کھینچ رہی ہے
لمحوں سے بھرا ہاتھ میں پیمانہ لئے میں
اپنا ہی کوئی عکس یہاں ڈھونڈ رہی ہوں

وہ اپنی نظم "دم فیصلہ" میں خود کی تلاش کو نیا رنگ دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ خود دریافتی کی منزل بہت دور ہے اور ستم یہ ہے کہ اسم اعظم سے در نہیں کھلتے۔ یہ تو انسان کی خود شناسی اور جہد و کاوش ہے جو طلسم زدہ دروازوں کو کھولتی ہے۔ وہ اپنے نظم "بے نام خواہش" میں اپنے ساتھ رہنے اور ساکت بیٹھ کر اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں اور خود سے گفتگو کرنے کی خواہاں ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم "کربلا کے نام" میں معرکہ حق و باطل کا دلدوز منظر کھینچا ہے اور آخر میں کہتی ہیں۔

فرات جل کو سپرد فرات کر ڈالا
یزیدیوں کو شہادت سے مات کر ڈالا

وہ عہد حاضر کو عہد منحرف کہتی ہیں جہاں انسان اپنے آپ سے اجنبی ہوا جا رہا ہے اور وہ اس

عہد کو ایک اجنبی سرزمین سمجھتی ہیں جو پتھروں کا ایک بھیانک شہر ہے جہاں پھول بھی برتنات کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں اور جہاں لوگ محض حال مست ہیں اور طلسمی جال کے اسیر ہو کر اس طرح زندہ ہیں کہ تمام اعلیٰ اقدار کو بھول چکے ہیں جو انہیں انسان کا شرف بخشتی ہیں۔ وہ بغاوت پر آمادہ ہو کر کہہ اٹھتی ہیں۔

پھر وہی ضرب جنوں کرب حسین
توڑ ڈالے جو کہ زنجیروں کے حلقے
جبر کے قانون سب
اور پھر بدلے نظام زندگی

شہناز اپنی شاعری میں اپنے آپ کی تلاش اور خود مختاری کی پیہم آرزو کا اظہار کر کے انسان میں اخلاقی اقدار کی لگن اور خود شناسی کے آدرش کو اپنانے کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ وہ بادل کی طرح پرواز کرنا اور چاندنی کے اجلے سیلاب کی طرح خود کو چار سو بکھیرنا چاہتی ہیں۔ ندی کی لہروں میں چاندنی کے بکھرنے کا منظر دیکھ کر وہ مبہوت ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے وجود کو منوانے کے اور اپنے آپ پر اختیار کے بڑے جمالیاتی اور غنائی طریق کی تڑپ رکھتی ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا کی تشکیل کی آرزو مند ہیں۔ جہاں نفرت اور انسان کی مسکراہٹیں اور خوشیاں چار سو بکھری ہوں۔ ان کے من میں جبر سے آزادی کی تمنا ہر لمحہ مضطرب رہتی ہے۔ لیکن جب وہ انقلاب کو ناکام ہوتے ہوئے اور آزادی کی مقدس خواہش کو روندے جانے کے پروسس کو دیکھتی ہیں تو وہ آگہی کو سراب اور محبت و رفاقت کو ایک پرچھائیں سمجھ کر کہہ اٹھتی ہیں۔

مجھے امان دے کہ اب
نہیں ہے مجھ میں حوصلہ
کسی بھی انقلاب کا
کسی نئے عذاب کا
کسی بھی اضطراب کا

ان کی کئی نظموں میں انسان کی بے چہرگی اور عدم تشخص پر افسردگی کا اظہار پایا جاتا ہے اور خیر و امن اور بہجت و سرخوشی کی تلاش پائی جاتی ہے تاکہ انسان اپنی زندگی باوقار طور پر گزار سکے۔ وہ روشنی اور روشن خیالی کی آرزو مند ہیں اور معاشرے کی حالت موجودہ Status Que کو بدل دینا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی نظم "لمحہ پنہاں" میں کہتی ہیں۔

حیرت آسا میری خاموش نگاہیں اکثر مری
ڈھونڈنے نکلی ہیں وہ لمحہ پنہاں شہناز
بے صدائی کے کنویں سے جو نکالے مجھ کو

خواہشوں سے پناہ بھی ڈھونڈ نہیں پاتیں کہ زندگی تو خواہشوں کا ایک سمندر ہے جسے انہوں نے برزخ احساس کہا ہے۔ وہ گزرے ہوئے لمحوں یعنی ماضی کے آنگن میں کئی تمناؤں کو دم توڑتے ہوئے اور کئی بکھرتے خوابوں کی کرچیوں کو دیکھتی ہیں۔ یہ ماضی کا ایک دلکش تصور ہے۔

شہناز مزمل کی شاعری مسلسل تلاش اور جستجو کی شاعری ہے۔ وہ دنیا کو ایک پردیس سمجھتی ہیں جہاں فرد کے خاموش آنسوؤں اور کرب و درد کو معاشرہ کوئی اہمیت نہیں دیتا اور جہاں فرد کو جینے اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ وہ فرد کو شب گزیدہ قرار دیتی ہیں جس کے آزار، تنہائی اور احساس کو بہت کم سمجھا جاتا ہے۔ شب گزیدہ فرد کے لئے شب غم کو مسخر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظم "سرد سناٹا" میں گہری خاموشی سے گھبرا کر اپنی سوچ میں ہلچل اور اپنے رگ و پے میں تیز سرسراہٹ کی آرزو کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔

خدایا!

برف سوچوں کو میری پگھلا

نیا سوچ جلا کر

میری یخ بستہ سوچوں کو روانی دے

میرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

ہم شاعرہ کو مسلسل اپنے آپ کی تلاش میں پاتے ہیں۔ اور وہ خود شناسی کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور اس ضمن میں بڑے گراں قدر اشعار کو پیکروں میں ڈھالتی ہیں۔

گزرے ہوئے لمحوں کی خلش آج مجھے کیوں
سوئی ہوئی تقدیس کا احساس دلا کر
تنہائی کے جنگل کی طرف کھینچ رہی ہے
لمحوں سے بھرا ہاتھ میں پیمانہ لئے میں
اپنا ہی کوئی عکس یہاں ڈھونڈ رہی ہوں

وہ اپنی نظم "دم فیصلہ" میں خود کی تلاش کو نیا رنگ دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ خود دریافتی کی منزل بہت دور ہے اور ستم یہ ہے کہ اسم اعظم سے در نہیں کھلتے۔ یہ تو انسان کی خود شناسی اور جہد و کاوش ہے جو طلسم زدہ دروازوں کو کھولتی ہے۔ وہ اپنے نظم "بے نام خواہش" میں اپنے ساتھ رہنے اور ساکت بیٹھ کر اپنے آپ کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں اور خود سے گفتگو کرنے کی خواہاں ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم "کربلا کے نام" میں معرکہ حق و باطل کا دلدوز منظر کھینچا ہے اور آخر میں کہتی ہیں۔

فرات جاں کو سپرد فرات کر ڈالا
یزیدیوں کو شہادت سے مات کر ڈالا

وہ عہد حاضر کو عہد منحرف کہتی ہیں جہاں انسان اپنے آپ سے اجنبی ہوا جا رہا ہے اور وہ اس

ہلچل، جنبش اور تقلیب کے لئے بے چین نظر آتی ہیں۔ اس لئے ان کے من میں لمحات موجود کے جبر سے آزادی کی امنگ بیدار رہتی ہے۔ وہ اپنی نظم "کہانی اپنی آگ کی" میں اپنی نے محابا تگ و دو، جدوجہد اور جستجو کی کہانی بیان کرتی ہیں۔ اپنی نظم "آزاد قیدی" میں وہ فطرت کے پر کیف مناظر کو اپنے سامنے پھیلے ہوئے دیکھتی ہیں جو ان پر آزادی کی پہنائی کو منکشف کرتے ہیں۔ لیکن وہ معاشرتی ماحول کی فرسودگی کی بناء پر خود کو ایک آزاد قیدی محسوس کرتی ہیں اور اپنی بے بسی پر متاسف ہیں۔ وہ رات کی یکسانیت سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

"سچ کے آنگن جھوٹ تماشا" شہناز کی ایک عظیم نظم ہے جس میں انہوں نے عالمی معاشرے کو منافقت کی گرفت میں رکھا ہے کہ سب لوگ جھوٹی شان و شوکت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ آرزو مند ہیں کہ زندگی کے آنگن میں سچ کے سدا بہار پھول کھلیں۔ ان کی نظم "بھنور" کئی تلخ حقائق کو سامنے لاتی ہے۔ ظلمت شب میں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ ہر شخص اپنی خواہش کی مدھم روشنی میں ایک بے سمت مسافر ہے جبکہ سارے معاشرے کے ماحول پر زندگی کے بے ربطی کا اندھیرا چھایا ہے۔ وہ مسائل کے بوجھ تلے ہانپتے ہوئے ماحول سے میرے کس عالم امکان کی تلاش ہیں۔

جسم کی اندھی فصیلوں سے صدا دے مجھ کو
کوئی بھی عالم امکان دکھا دے مجھ کو

معاشرتی ماحول کی سنگینی انسان کے دل کو خون کر دیتی ہے۔ لیکن انسان پھر بھی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ وہ کسی رکاوٹ اور کسی دکھ سے متاثر نہیں ہوتا اور ایک جلتی ہوئی امید اس کے من میں زندہ رہتی ہے۔ یہی روشن امید شاعرہ کو اپنی نظم "چاپ" میں ہمیشہ سہارا دیتی ہے۔

گوش پر آواز ہوں اک چاپ سننے کے لئے

وہ اپنی نظم "عکس تمنا" میں اس حقیقت کو منعکس کرتی ہیں کہ دنیا کے رشتے چاہے جتنے بھی اندوہناک ہوں انسان ان رشتوں کو توڑ نہیں سکتا۔ اسی لئے انسانی رشتوں کا تعلق، خوشگوار اور انسانی ہونا ہی بہتر ہے تاکہ انسان اسی دنیا میں اپنی چند روزہ زندگی کو سکون محبت اور رفاقت سے گزار سکے۔

محترمہ شہناز مزمل کی غزلیں بھی گراں قدر معانی رکھتی ہیں۔

جو بھی قرض تھا میری جان پر وہ یہیں میں نے چکا دیا
رہی فکر مجھ کو نہ سود کی تو ہر اک زیاں سے گزر گئی
میرا شوق تھا میرا ہم سفر، تھی بلندیوں پہ میری نظر
نہ زمیں کی قید میں رہ سکی ہر اک آسماں سے گزر گئی
وہ شب گزیدہ مسافر بھٹک نہ جائے کہیں
سحر قریب ہے کوئی اسے خبر کر دے

# "کس دیوار پہ تصویر"

**اعتبار ساجد**

بچپن میں ہم نے عجائب گھر کے نوادرات کے علاوہ ایک اور چیز بھی دیکھی تھی۔ یہ ایک خاتون لائبریرین تھیں۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ چہرے اور لباس پر گرد کی تہیں۔ ناک کی پھننگ پر پسینے کے قطرے۔ بولتیں تو لگتا کسی پرانی کتاب کے خستہ اوراق کھڑکھڑا رہے ہیں۔ چلتیں تو کاغذی پیرہن میں نقش فریادی نظر آتیں۔ ہر وقت ایک الماری سے دوسری الماری اور ایک شیلف سے دوسرے شیلف میں کتابیں الٹ پلٹ کرتی رہتیں ساتھ ہی ساتھ زیر لب کچھ بڑبڑاتی رہتیں۔ پورا فقرہ تو کبھی سنائی نہیں دیا الفاظ البتہ کچھ اس قسم کے ہوتے۔ "ترتیب ----- گڑبڑ ---- نمبرنگ ----- سیریل ---- کیٹلاگ ---- مصیبت ---- قیامت ---- آچھیں ---- آخ تھو ----"۔

بچپن کا پہلا نقش ذہن میں کچھ اس طرح بیٹھا کہ تمام خواتین لائبریرین پر سے صنف نازک ہونے کا ایمان اٹھ گیا۔ مگر جب حال ہی میں لائبریری سائنس کی ڈگری اور ڈپلومہ کلاسوں کے قریب سے گذر ہوا تو خوشبوؤں کے جھونکوں اور رنگ برنگے ملبوسات نے یقین دلایا کہ ۔ ۔

ابھی کچھ رنگ باقی ہیں جہاں میں

ویسے بھی علامہ فرما گئے ہیں ۔ ۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

بحمد اللہ کہ ہم بھی اسی خیال کے قائل ہیں کہ جن شعبوں میں خواتین کی شمولیت ہے ان شعبوں کا اپنا رنگ خواہ کیسا ہی آزردہ' خشک' بے کیف اور بے روح کیوں نہ ہو' کم از کم وہاں کام کرنے والی خواتین کا اپنا رنگ ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ تاکہ ماحول کی یاسیت اور اداسی کم ہو۔ ان کے لیے بھی اور ہمارے لئے بھی۔ ہر چند کہ شہناز مزمل کا شعبہ کار تو لائبریری کے شیلف ہیں لیکن دائرہ کار ادب اور بالخصوص شاعری ہے۔ الحمد اللہ کہ خوش فکر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش وضع بھی ہیں۔ شاعری میں الفاظ کا چناؤ۔ اور لباس میں رنگوں کا انتخاب کرنا جانتی ہیں اسی لئے

ان کی شاعری کی طرح شخصیت بھی نفیس ہے۔ خواتین کا ہم احترام بھی کرتے ہیں ان کے اشعار پسند بھی کرتے ہیں لیکن ایک بات کی ہمیں اب تک سمجھ نہیں آئی کہ خواتین کو غزل کہنے کی کیا ضرورت ہے یہ تو خود ہی صنفِ غزل ہیں غزل تو کچھ مردوں ہی کو زیب دیتی ہے کہ یہ بچارے، ہجر کے مارے غزل نہ کہیں تو پھر اور کس جال سے محبوب یا بیوی کی تسمہ کشی کریں۔ اور کس ہتھیار سے اس کے گوڈے گٹے ناکارہ کریں کہ پھر کہیں اور کا رخ کرنے کے قابل نہ رہے حد یہ کہ میکے بھی نہ جا سکے۔

لیکن خواتین کو غزل کی کھکھیڑ اور تردد کی اس لئے چنداں ضرورت نہیں کہ میاں کو منانے کے لئے لکس صابن سے منہ دھو کر آنکھ میں سرمے کی لکیر کھینچ لینا ہی کافی ہے۔ سمجھئے کہ پوری مرصع غزل مطلع سے مقطعے تک تیار ہے۔ اور اگر منہ دھونا اور آنکھ کے اشارے کے ساتھ اتنا ہی کہہ دینا پوری غزل کہہ دینے کے مترادف ہے۔ ہائے اللہ جی!۔

شہناز مزمل سے ملئے تو ہر دم فریش۔ مگر ان کی شاعری سے ملئے تو درد کی ایک لہر ہے جو مصرعوں کے اندر مچلتی بل کھاتی دکھائی دیتی ہے ۔

ستارگاں بھی مجھے معتبر نہیں لگتے
میں ایک جبر مسلسل کے اختیار میں ہوں

ہم اگر مرد نہ ہوتے تو بہتر طور پر سمجھ سکتے کہ مرد کی فطرت کیا ہے۔ اب اس مغالطے میں مارے جاتے ہیں کہ جس بات کو ہم عادت کے معنوں میں لیتے ہیں وہ عورتوں کے نزدیک فطرت ہے اور مردوں کے بارے میں ان کی عمومی اور اجتماعی رائے کو بدلنا مشکل ہے۔ لہٰذا سمجھدار خواتین اپنے مخاطب مرد کو حفظ ماتقدم کے طور پر بھائی یا بیٹا کہہ دیتی ہیں تاکہ مرد کی فطرت کا طیارہ ساؤنڈ بیریئر کراس نہ کرنے پائے۔ شہناز مزمل بھی خوش اسلوبی سے یہی گر آزماتی ہیں۔ اور اپنی عمر سے آٹھ دس سال بڑے مرد کو بھی بیٹا کہہ کر اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑتیں کہ وہ کچھ سوچ سمجھ سکے۔ مثلاً" ۔

چاند کے روپ میں سو بار مرے سامنے آ
کوئی نادان نہیں ہوں کہ مچل جاؤں گی

ان کا ایک

مجھے جال میں اب نہ الجھا سکو گے
تمہیں ناخدا میں بنانے لگی ہوں

ہمیں یقین تو نہیں البتہ کچھ کچھ احتمال یہ ہے کہ کاغذ پر اترنے سے پہلے یہ شعر اس طرح ان کے ذہن میں آیا ہو گا۔

مجھے چال میں تم نہ الجھا سکو گے
تمہیں اپنا بیٹا بنانے لگی ہوں

شہناز مزمل کے ہاں زندگی کے دکھوں کا تجربہ بھی ہے تلخی بھی اور امید کی کرن بھی۔

زندگی میں ہم نے دیکھیں الجھنیں ہی الجھنیں
الجھنوں سے کس طرح ہو گی رہائی دیکھئے

یہی نہیں کہ شہناز دوسروں کو بیٹا کہتی ہیں وہ خود بھی ماں ہیں۔ اور ایسی ماں جو اولاد کے دکھ درد کی خاطر اپنا سکھ چین لٹا دیتی ہے۔ ممتا کی یہی بیکرانی ہے جو کہیں کہیں موتیوں کی طرح ان کے اشعار میں اپنی چھب دکھلاتی ہے۔

کھا کھا کے زخم خون سے بھر لی ہیں انگلیاں
جو خار تیری راہ میں پایا ہٹا دیا

سچ پوچھئے تو جس محبت میں ممتا کی رفعتوں، عظمتوں اور وسعتوں کو چھونے کی سکت نہ ہو ہم اسے مروت سمجھتے ہیں۔ اور عام کرنسی کال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کے نام سے کی جانے والی سطحی یا عمومی شاعری کی ایک وافر مقدار ہمیں بے روح اور بے جان کاغذوں کا ڈھیر اور خس و خاشاک کا انبار معلوم ہوتی ہے یعنی شاعر نے قافیے ردیف کی چولیں فٹ کر دی ہیں کسی طرح اس میں محبت کا لفظ ٹھونک دیا ہے لیجئے وہ اپنے فرض سے چکتا ہوا۔ نہ دو مصرعوں کے بیچ میں جذبہ چھنکا نہ درد ٹھنکا۔ ہمارا خیال ہے ممتا کا رچاؤ شہناز کے خون اور مزاج میں ہے اسی لئے شعر میں اس نے اپنا وجود ظاہر کر دیا۔ ورنہ یہ ایسا ضروری بھی نہیں کہ جو ماں ہو، اس میں ممتا بھی ہو اور جس میں ممتا ہو وہ شاعری میں اس کے اظہار پر قادر بھی ہو۔ ہر چند کہ سنتے آئے ہیں جہاں ممتا ہے وہاں ڈالڈا ہے۔

آج کل ہمارے ہاں ایسی شاعری ہو رہی ہے کہ اگر زید کی غزل پر بکر کا نام لکھ دیا جائے اور بکر کی غزل پر عمر کا نام درج کر دیا جائے تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس عہد میں شعراء کی اکثریت ایک ہی طرح سوچ رہی ہے اور ایک ہی جیسے موضوع پر، الفاظ کے ملتے جلتے استعمال سے ایک ہی جیسے ملغوبے یعنی غزلیں تیار ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ جملہ شعرائے کرام ایک ہی امتحان گاہ میں بیٹھے ایک جیسا پرچہ حل کر رہے ہیں۔ ٹرینگ کے عمل میں اگر کسی کے شعری خدوخال کچھ مختلف ہوں تو لامحالہ توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔

شہناز کی شاعری اپنے ہم عصروں سے بہت زیادہ مختلف تو نہیں ہے البتہ کہیں کہیں ان سے ایسے اشعار سرزد ہو گئے ہیں۔ جو بھیڑ چال سے ذرا مختلف رفتار کے حامل ہیں۔ مثلاً" ۔

کسی گم گشتہ ساعت کی طرح اب
میں ذہنوں سے نکلنا چاہتی ہوں

شب گزیدہ مسافروں کے لئے
صبح کا انتظار مشکل ہے

بھر چکے ہیں تمام پیمانے
خود پہ اب اختیار مشکل ہے

اب جنوں کی انتہا ہونے کو ہے
کیا خبر کیا سانحہ ہونے کو ہے

کون جانے وہ پھر پلٹ آئے
آخر شب دیا جلا رکھنا

کیوں ہوں خاموش یہ اک راز نہاں ہے شہناز
یہ غلط ہے کہ نہیں جرات اظہار مجھے

میں کھو گئی ہوں مگر اب گمان بولے گا
مکیں بغیر یہ خالی مکان بولے گا

انکا، ایک شعر، جس سے ان کی کتاب "عکس دیوار پر تصویر" کا نام نکلا ہے، کچھ اس طرح ہے ------۔

مل ہی جائے کبھی تعبیر کو شائد اک خواب
عکس دیوار پر تصویر بنا دی ہم نے

ہر چند کہ "میری تعبیر" کی جگہ اس مین "ہماری تعبیر" کا مقام ہے کیونکہ ردیف "ہم نے" ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غور طلب بات عکس دیوار پہ تصویر بنانے کا عمل ہے۔ لوگ اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کے لئے یا تو فالنامہ یوسفی کا سہارا لیتے ہیں یا ماہر عملیات و جنات وغیرہ کا۔ اسی روش کو قطع کرنے کے لئے شہناز مزمل نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے یعنی وہ خواب کی تعبیر نہیں چاہتیں۔ تعبیر پہلے سے موجود ہے۔ اب ایک عدد خواب درکار ہے۔ مل جائے تو صد بسم اللہ نہ ملے تو شکر اللہ ۔کہ شہناز قناعت پرست ہیں' اللہ کی رضا پہ شاکر۔ انہیں خواب بھی اللہ کی خوشنودی کے زیر سایہ چاہئے۔

آج کل شاعری میں کچھ روحانیت' کچھ باطنیت اور کچھ تصوف ڈالنے کا رواج ہے۔ تاکہ بات میں کچھ وزن پیدا ہو اور لوگ مرعوب ہوں۔ شہناز مزمل نے بھی اس مقبول عام نسخے کی چند جڑی بوٹیاں استعمال کی ہیں لیکن ضرورت کے تحت۔ لوگوں کو خوامخواہ مرعوب کرنے اور ڈرانے کے لئے نہیں۔ اسی لئے ان کی بات نے وزن کے علاوہ اثر ہی نہیں حلقہ اثر بھی پیدا کر لیا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ حلقۂ فرزندانِ شہناز تشکیل دے دیا ہے۔ لیکن بطور شاعرہ بھی ان کا کلاسیکی رنگ میں رچا ہوا لہجہ میں کہیں بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ زبانی ہم ہر شخص کی تعریف پر کمربستہ رہتے ہیں لیکن جب تحریری بیان کی نوبت آتی ہے تو ایک دم ہم چوکنے ہو جاتے ہیں۔ پھونک پھونک کے وادی قرطاس میں قدم یعنی قلم رکھتے ہیں۔ اور لحاظ مروت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ یہ سبق ہم نے پروفیسر زیڈ ایم طوفانی سے سیکھا۔ اتفاق سے وہ

اس کالج کے پرنسپل تھے جہاں تدریس کی ذمہ داری ہمیں سونپی گئی تھی۔ سال بھر تک پروفیسر موصوف خوب لک لک کر، جھپٹ جھپٹ کر، لپک لپک کر ملتے ہماری تعریفوں کے پل باندھ دیتے۔ توصیف کے پہاڑ کھڑے کر دیتے لیکن سال کے اختتام پر جونہی سی آر کا موسم آتا۔ وہ اپنے کمرے میں قلعہ بند ہو جاتے۔ مسکرانا بند۔ ملنا موقوف۔ جب کسی کام سے پرنسپل کے دفتر کا رخ کیا، چپڑاسی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا راہ میں حائل ہو گیا۔ کہ صاحب مل نہیں سکتے۔ کانفیڈنشیل رپورٹیں لکھ رہے ہیں۔ کیا لکھ رہے ہیں اس کا انکشاف بعد میں ہوتا کہ ہماری جن خصوصیات کی تعریف میں انہوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے تھے۔ انہی کے بارے میں اندر بیٹھے 'بلو ایورتج' بلو ایورتج کی گردان کر رہے تھے۔!

("غالب ہمیں بھی چھیڑ" سے لیا گیا)

○

○

دھوپ کی چادر اوڑھ کے سر پر چلتی ہوں
اپنی آگ میں تنہا خود ہی جلتی ہوں

آوازوں کے بوجھ کی گٹھڑی لاد کے میں
چپ کے زینے خاموشی سے چڑھتی ہوں

خود کو یکجا کر لینے کی کاوش میں
ریزہ ریزہ ہو کر روز بکھرتی ہوں

# عکس دیوار پہ تصویر پر ایک فلسفیانہ نظر

## قیصر امین الدین

محترمہ شہناز مزمل نے "عکس دیوار پہ تصویر" کا ایک نسخہ جن دنوں مجھے بھیجا۔ میں افلاطون کے "ڈائیلاگز" کو چھٹی بار پڑھ رہا تھا۔ رات گئے فلسفیانہ موشگافیوں سے گھبرا کر "ڈائیلاگز" کو بند کیا اور "عکس دیوار پہ تصویر" کو پڑھنا شروع کر دیا۔ تین چار روز "ڈائیلاگز" اور عکس دیوار پہ تصویر پڑھنے میں گزر گئے تو میں نے سوچا کہ محترمہ شہناز مزمل کی اس کاوش کا فلسفیانہ تجزیہ کرنے کی سعی کی جائے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ پتہ نہیں یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔

افلاطون نے "محبت" Love کو ایک جذبہ اپنے سے بالاتر اور عظیم تر کے لئے جستجو قرار دیا ہے۔ یہ جستجو انسان کی نفسیاتی ترکیب (Psyche) میں جاگزین ہوتی ہے اور اسے افلاطون نے ایروس (Eros) کا نام دیا ہے جو محبت کے دیوتا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی توضیح کے لئے افلاطون نے سقراط کا سہارا لیا ہے اور سقراط نے اپنی مدد کے لئے اپنی معلمہ ڈائیوٹیما (Diotima) کو پکارا ہے۔ جو کہتی ہیں کہ محبت ایک روحانی قوت (Daimon) ہے۔ جس کا تعلق آسمان اور زمین کے درمیانی عالم سے ہوتا ہے۔ (وضاحت کے لئے عالم برزخ کا نام لیا جا سکتا ہے)۔ یہ دراصل ایک ایسی قوت ہے جو انسان اور کائنات کے درمیان مقام زیریں سے مقام ارفع تک محو پرواز رہتی ہے۔

سقراط کی معلمہ بتاتی ہے کہ ایروس (Eros) تونگری کے دیوتا (Poros) اور غربت کی دیوی (Penia) کی باہمی رفاقت کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے وہ کہتی ہے "اولاً" تو وہ ہمیشہ عسرتی کا شکار رہتا ہے اور نازک و خوبصورت نہیں ہے جیسے کہ بہت سے اسے سمجھتے ہیں۔ وہ کھردرا سا اور صاف ستھرا بھی نہیں ہے۔ نہ اس کے پاؤں جوتے ہیں نہ رہنے کو مکان اور ننگی زمین پر وہ کھلے آسمان کے نیچے لیٹا رہتا ہے یا پھر گلیوں میں یا گھروں کے دروازوں پر آرام کرتا رہتا ہے۔ اپنی ماں کی طرح ہمیشہ مصائب میں مبتلا رہتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح جس سے وہ جزوی طور پر مشابہ ہے۔ ہمیشہ خوبصورتی اور اچھائی کے خلاف سازشیں کرتا رہتا ہے۔ وہ بہادر' ہمت والا اور مصروف جستجو' مضبوط اور ایک طاقتور شکاری ہمیشہ ایک نہ ایک سازش کے جال بنتا ہوا' سنجیدگی سے عقل کا طالب' ذرائع میں زرخیز' ہر دور کا فلسفی' خوفناک حد تک دل لبھانے والا' ایک جادوگر اور ایک سوفسطائی (Sophist) ہے۔ فطری طور پر وہ نہ فانی ہے نہ غیرفانی۔ لیکن ایک لمحہ زندگی اور نشوونما پاتا ہوا (جب وہ حالت تونگری میں ہو) اور دوسرے لمحہ مردہ اسی دن مگر پھر زندہ اپنے باپ کی فطرت کے مطابق۔ لیکن جو بھی اندر کی طرف بہتا ہے۔ اسے باہر کی طرف بہتا ہوتا ہے اس لئے وہ کبھی بھی عسرتی یا

تونگری کی حالت میں نہیں رہتا اور جہالت اور علم کے درمیان انکار رہتا ہے۔ معاملہ کی سچائی یہ ہے کہ کوئی دیوتا فلسفی نہیں ہوتا نہ ہی وہ عقل کی جستجو کرتا ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی عاقل ہے۔ نہ ہی کوئی آدمی جو عاقل ہے عقل کے حصول میں محو ہوتا ہے۔ نہ ہی جاہل عقل کے متلاشی ہوتے ہیں اور یہاں ہی جہالت کی برائی مضمر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ جو نہ تو اچھا ہے نہ عقل مند اپنے آپ سے مطمئن رہتا ہے۔ وہاں کوئی خواہش نہیں ہوتی جہاں احساس طلب نہ ہو"۔

افلاطون بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت اپنے آپ کی تحقیق (Self Interrogation) یا تحلیل نفسی کا دوسرا نام ہے جو انسان کی نفسیاتی ترکیب کے لاشعوری حصوں کا رابطہ اس کے شعور سے ہموار کرتی ہے۔

ڈائیلاگ "سمپوزیم" (Symposium) میں محبت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ اسے نیم دیوتا نیم فانی ایروس (Eros) کہہ کر ایک ایسی کوشش قرار دیتا ہے، جو خوبصورتی کو دائمی طور پر اپنا لینے کے لئے کی جاتی ہے۔ گو اسے اپنے اندر کی کم مائیگی اور جہالت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا لطیف احساس ہے۔ ایک ایسی آگہی ہے جس میں خوشی اور غم یا اداسی ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ آگہی سچائی اور خوبصورتی کی جستجو میں رہتی ہے اور اس کا رابطہ بیک وقت نیکی اور بدی دونوں سے ہوتا ہے۔ اس جذبے کی تمام کاوشوں کا واحد مقصد حقیقت، خوبصورتی اور اچھائی میں ضم ہو جانا ہے۔ تاکہ روح میں نیکی اور عقل کی تخلیق یقینی ہو جائے۔

سقراط اور افلاطون کی متذکرہ بالا ذہنی کاوش کا مقصد انسان پر ایک خاص قسم کی سزا طاری کرنا ہے جو اسے ہر وقت مجبور کرے کہ وہ اپنے آپ کا تقابلی جائزہ اس اعلیٰ ترین معیار سے لیتا رہے جو اسے بتاتا ہے کہ انسان کو کیا ہونا چاہئے۔ یعنی انسان اپنی تحلیل نفسی کے عمل میں اس قدر محو ہو جائے کہ وہ ہر وقت یہ سوچتا رہے کہ وہ ہے کیا اور اسے کیا ہونا چاہئے؟

فلسفہ کے ایک مختصر سے پہلو کے تناظر میں "عکس دیوار پہ تصویر" کی حمدوں، نعتوں اور نظموں کا جائزہ لیا جائے تو شہناز مزمل اسی محبت میں مبتلا نظر آتی ہیں جسے افلاطون نے ایروس (Eros) کا نام دیا ہے اور جس کی وضاحت مندرجہ بالا سطور میں عام قاری کی بوریت کو یقینی بنا کر دی گئی ہے۔

شعور کا لاشعور سے رابطہ کیوں؟ کیا ہوں "کیا ہونا چاہئے تھا؟ رات کیوں طول پکڑ گئی۔ یہ صبح سے ہمکنار کیوں نہ ہوئی۔ ماحول کا اندھیرا روح پر کیوں محیط ہو گیا۔ میرے اردگرد جتنے انسان آباد ہیں کیا اتنے انسان میرے اندر بھی آباد ہیں۔ ان تمام انسانوں کی بدیاں نیکیاں سب کی سب میرے شعور و لاشعور کے نہاں خانوں میں کیوں موجود ہیں۔ یہ سب سوالات شہناز مزمل نے ایک اچھے شاعر کی مانند اس کتاب کی سطور میں بکھیر دیئے ہیں۔

تحلیل نفسی ایک طویل سفر ہے جس میں شاید ہر کوئی مبتلا ہوتا ہے گو اس کا ادراک چند ایک کا ہی مقدر بنتا ہے۔ شاید ہر ایک یہ سفر بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہانے، ریت کے گھروندے بنانے،

کیونکہ اس کے اندر پوری کائنات آباد ہوتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے، توڑ پھوڑ کا سلسلہ شدت اختیار کرتا رہتا ہے اور ایک انسان کے اندر موجود کائنات کے تمام عناصر ایک ایک کر کے تباہ ہوتے یا غائب ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی قہقہے لگانے والوں کا جم غفیر موت کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ کبھی رونے منہ بسورنے والے راہ عدم اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی چاند ایک دوسرے سے ٹکرا کر، کبھی سورج، ستارے اور سیارے آپس میں ٹکرا کر فنا ہوتے رہتے ہیں۔ جذبے ہاکان، احساسات مردہ، اور خیالات پریشان ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک قوت زندہ رہتی ہے اور وہ ہے محبت جو انسان کو اپنے وجود میں بار بار غوطے لگانے پر مجبور کئے رکھتی ہے تاکہ وہ یہ جان لے کہ وہ کیا ہے؟ اسے کیا ہونا چاہئے یا کیا ہونا چاہئے تھا؟ یہی وہ جذبہ ہے جو منصور ابن حلاج کو مصلوب ہو جانے سے چند لمحے قبل اپنے ماننے والون کے اصرار پر کہ انہیں کوئی نصیحت یا وصیت کی جائے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے آپ کا مطالعہ کرو۔ (Study yourself)۔ عکس دیوار پہ تصویر شہناز مزمل کی اپنی ذات کے مطالعہ کی ایک بھرپور، دلکش اور کامیاب کوشش ہے۔ پہلی حمد میں یہ شعر

ترس رہی ہوں میں انوار صبح کو کب سے
ورود نور سحر میرے نام کر دیتا

اسی جذبے کی کارفرمائی ہے جو بقول افلاطون عالم زیریں سے عالم بالا کی طرف مائل پرواز رہتا ہے اور نعت کا یہ شعر

میرے حرف کو جو ملی صدا
میرے جذب نے مجھے دی ندا

الفاظ مختلف کیوں نظر نہ آئیں۔ اونچی اڑان کی ہی جستجو لئے ہوئے ہیں اور جب سفر شروع ہو جائے تو

بشارتیں ہوا کرتی ہیں روح میں تخلیق
دوروں دل نہیں پاتی ہیں وسعت تسخیر

شرر تمام ہی میری زبان میں بن جائیں
زمین پہ پھیلیں، نیا آسمان بن جائیں

یہ امید و ناامیدی کا سفر ہے۔ تونگری اور عسرتی کا سفر ہے۔ روشنی اور اندھیرے کا سفر ہے۔ سورج کو بچانا چاہئے اسے مرنے نہیں دینا چاہئے کہ سورج کے مر جانے سے اڑان میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے

ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کے لئے

ریت سے گھر پہ نئی دیوار اٹھا دی ہم نے

طوفان کی آنکھ میں بیٹھ کر طے ہونے والا سفر ہے جو مسافر کو کبھی شکار کبھی شکاری بنا دیتا ہے۔ وفاؤں اور بے وفاؤں سے ہم کنار کرتا ہے۔ ظاہری تمام طلسم توڑ کر باطن میں کسی کھوئی ہوئی چیز کو کھوجنے کی سعی میں مبتلا کر دیتا ہے اور

فصیل جسم کی اس قید سے رہا ہو کر
حصار روح میں باقی گیان بولے گا

کہ شاید سفر جاری رکھنے کی بنیادی شرط ہی یہی ہے اور اسی نے یہ کہنے کا حوصلہ دیا ہے کہ

صلیب وقت کندھوں پر اٹھا کر
میں تھوڑا تیز چلنا چاہتی ہوں

حالانکہ

شب گزیدہ مسافروں کے لئے
صبح کا انتظار مشکل ہے

اور

سانس روکے دم بخود بیٹھے ہیں شہناز
ہو چکے گر معجزہ ہونے کو ہے

یقین اور عدم یقین، سچ اور جھوٹ نفع اور نقصان، آرام و تکلیف، بدی و نیکی کوئی معانی نہیں رکھتے کہ یہ سب ظاہری الفاظ و اصطلاحات ہیں۔ ان کی دیواروں کے پیچھے کوئی اور مفہوم چھپا بیٹھا ہے۔ البتہ یہ مسافر کو یہ کہنے پر مجبور ضرور کر دیتے ہیں کہ

راہ تاریک ہے منزل کا نشان دھندلا ہے
کرمک شب بھی مسافر کو خضر لگتا ہے

یا پھر یہ کہ

ستارگاں بھی مجھے معتبر نہیں لگتے
میں ایک جبر مسلل کے اختیار میں ہوں

جبر مسلسل شہناز مزمل کے لئے محبت ہے۔ ایروس (Eros) ہے۔ وہ سفر جاری رکھنے پر مجبور ہے کیونکہ انہیں یہ امید بھی ہے

چلتے چلتے کبھی مل جائے گی منزل مجھ کو
گرتے گرتے میں کسی روز سنبھل جاؤں گی

جبر کی شدت کو کم کرنے کے لئے رواقی (Stoic) رویہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس لئے شہناز مزمل یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

یہ رویہ سدا روا رکھنا

اسی قسم کے ذہنی رویے کے دباؤ کے تحت وہ یہ کہنے سے بھی ہچکچاتی نہیں ہیں۔

عشق کی ناؤ بہا کر ہجر کے پانی میں یوں
کہنا میرے پاس مت آنا اسے اچھا لگا

یا یہ

روداد غم زباں پہ لاتے تو کس طرح
محفل میں باقی کوئی بھی غم آشنا نہ تھا

یا یہ

شعلہ نوائیوں کی سزا دیجیے مجھے
محفل عروج پر ہے اٹھا دیجیے مجھے

کیونکہ

دیئے میں انا کے جلانے لگی ہوں
میں سورج نیا ساتھ لانے لگی ہوں

لاشعور اور شعور کا رابطہ قائم ہوے کو ہے۔ سفر جاری ہے۔ وہ کسی شاعر کی ہمنوا ہو کر یہ کہنا چاہتی ہیں۔

ہم سے کہتا ہے راہ کا منظر
نہ کسی پہ مسافتیں اتریں

مگر ان کی انا الفاظ کے پیراہن کو بدلنے پہ اکسارہی ہے۔ اس لئے وہ محض یہ کہتی ہیں۔

میرا مذہب ہے محبت' میرا مشرب ہے وفا
دشمنوں سے بھی ہے اپنوں کی طرح پیار مجھے

یہ وہی افلاطونی محبت ہے یا اس کی طلب ہے کہ وہ یہ کہہ رہی ہیں۔

پہچاننے کا خود کو بہت اشتیاق ہے
اپنے لئے کہیں پہ رخ آئینہ بھی ہو

یا یہ کہ

من مندر روشن رکھنے کو
میں نے دل کے زخم جلائے

یا پھر یہ کہ

سوائے درد کے کوئی نہیں میرا مونس

سوائے غم کے کوئی میرا غم گسار نہیں

کہیں اور شہناز مزمل کی طرح کوئی مسافر پکار اٹھا ہے۔

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو میں نہ ملا اور مجھ کو تو نہ ملا

انہوں نے یہ آواز سنی اور کہا۔

قربت تیری نہ اپنے نصیبوں میں ہو سکی
تو نے تو دوریوں کو مقدر بنا دیا

اور اب

چونچ میں کنکر لئے بیٹھی ہوں تشنہ لب
کوزہ امید میرا پھر سے بھر جائے گا کب

مگر کوزہ امید بھرنے کی شرط یہ ہے کہ محبت کے سفر کو اختتام تک پہنچایا جائے۔ اپنی ذات کی پہچان حاصل کی جائے تاکہ ظاہری حقائق کو پس منظر میں دھکیل کر اصل حقائق سے شناسائی حاصل ہو مگر ابھی تو صورت حال یہ ہے۔

میں پر بریدہ ہوں' کیسے سفر کی بات کروں
ڈسا ہے شب نے میں کیسے سحر کی بات کروں

یا یہ کہ

بنا پتوار کشتی ڈولتی ہے موج دریا پر
ہوا کے رخ پہ اس کو اک نیا ساحل دکھا دو نا

مگر خود پہ اعتماد بدستور ہے

میں ہوں بردوش ہوا' ہمت نہ میری آزما
یہ ہوا سرکش دیا بھڑکائے اس کی کیا مجال

حالات سے نبرد آزما رہنے کا جذبہ موجود ہے۔

کہو زمان و مکاں سے کہ میرے ساتھ چلیں
ہے تیز رخش سفر' میں تو رکاب میں ہوں

محبت میں مبتلا مسافر کے اندر پوری کائنات آباد ہوتی ہے۔ سفر کے دوران وہ ظاہری حقائق کے

پیچ پناہ باطنی حقائق سے روشناس ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے وہ یہ کہنے سے بھی ہچکچاتا نہیں۔

کرن کرن کو ترسنے والے
اندھیری بستی میں بسنے والے
تلاشنے کو نکل پڑے ہیں
چھپا کہیں آفتاب ہو گا

کیونکہ وہ سمجھتا ہے یا سمجھتی ہے۔

سفر ہے امکان کا سوچتی ہوں
یہ لاشعوری سفر ہے میرا
شعور کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوں
مگر رضائے نفس بنا تو
بہت ہی مشکل ہے منزلوں کے نشان پانا
اور
سفر ہے امکان کا
لامکاں تک
کیونکہ

مجھے درپیش ہے جاناں سفر ذات انا کا بھی
مجھے تسخیر ذات جسم و جان سے آگے جانا ہے
اور ابھی تک محض یہ ہوا ہے کہ

اک آس کے جنگل میں کھو کر
میں اپنا آپ گنوا بیٹھی
رخ موڑا سکھ کی چھایا نے
نت جوت غموں کی جگا بیٹھی

محبت اور اس کے سفر کی وضاحت ہو چکی' آسمان اور زمین میں رابطہ قائم ہو چکا' نظر میں گہرائی اور گہرائی در آئی' مسافر تحقیق نفسی کی کئی منازل طے کر کے اب اس مرحلے میں داخل ہو گیا ہے جہاں سوال پوچھے جاتے ہیں۔ جہاں افلاطون سقراط سے سوال کرتا ہے۔ سقراط ڈائیوٹیما سے سوال کرتا ہے یا السی بیڈر (Alcibiades) سے سوال پوچھنے اور اس کا لیکچر سننے پر آمادہ ہے کہ

خواب فردا کس کو ملے گا
رات کا دریا کب اترے گا
صبح کا سورج کب نکلے گا

دل دیوانہ کب سنبھلے گا

اور پھر ان کی رہنمائی پر بھی آمادہ ہے۔

کیا کچھ چھپا ہوا ہے خلائے بسیط میں
اس کرب آگہی سے گزر کے تو دیکھنا

قرب آگہی نے محبت کے مسافر کو ایک بلند مقام سے نوازا ہے اور وہ حقائق ظاہری (Appearances) کو ان کے باطنی تناظر میں دیکھ سکتا ہے۔ اطمینان کی ایک لہر اس کے سروپا میں سرایت کر گئی ہے اور وہ یہ پوچھنے پر مائل نظر آتا ہے۔

کون سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے آیا
کون اجڑے ہوئے اس گھر کو بسانے آیا
عمر بھر عشق پریشان نے ڈھونڈا جس کو
آج یہ بات مجھے کون بتانے آیا

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ

من اندر ہے پی کی صورت
بیاکل دیکھ نہ پائے
من کی اکھیاں روشن کر لے
پی کے درشن پائے

قرض وفا چکانے اور خود فریبی کے جال سے باہر نکل آنے کا وقت آگیا ہے۔ محبت کا سراب یہ کہنے کا حوصلہ کر چکا ہے۔

وہی آواز میرے شوق کو بھڑکاتی تھی
سوئے منزل مجھے دوڑائے لئے جاتی تھی
میری پرواز جنون خیز ہوئی جاتی تھی
آتش شوق بھی کچھ تیزی ہوئی جاتی تھی
راستے سب مجھے منزل کا پتہ دیتے تھے
اور میرے ذوق مسافت کو بڑھا دیتے تھے
میری پرواز تھی آواز کی پرواز کے ساتھ
دوڑتی جاتی تھی میں وقت کی آواز کے ساتھ

اب عقل و دانش کے تاج محل تعمیر کرنے کا وقت آگیا ہے۔ یہ شاید محبت کے مسافر کی آخری منزل ہے اور اسی لئے وہ اس حالت میں ہے کہ دوسروں کو بتا سکے۔

میری ششدر سی نگاہوں کو پریشان پا کر

۔۔۔ سے حضرت مجذوب نے پوچھا اگر

جذب و مستی کی بقا تو نے کبھی دیکھی ہے

عشق و ہستی کی فنا تو نے کبھی دیکھی ہے

فلسفہ جذب و فنا کا جو سمجھ جائے تو

پھر تو بن جاتے ہیں کتنے ہی حسین تاج محل

محبت کا مسافر مجذوب کو یہ بتاتا ہے کہ اس نے ایسی تمام منازل طے کر لی ہیں اور اب

ایک ہی پل میں چھنک جاتی ہے گزری ظلمت

کوئی احساس میں چپکے سے اتر آتا ہے

کل کی تلخی کل کا ہر اک لمحہ بھلانے کے لئے

مرہم درد میرے زخم پر رکھ جاتا ہے

اب زخم مندمل ہونے کا موسم ہے۔ دوسروں سے پوچھا جا سکتا ہے۔ صرف ان کے علم کی وسعت جاننے کے لئے "تفسیر محبت" اور تکمیل محبت کے کیا معانی ہیں؟ "دنیا کی حقیقت" کیا ہے؟ اور محبت میں مبتلا کسی انسان کی تشنہ لبی کم ہو سکتی ہے۔ ان تمام سوالات کے جوابات کسی اخلاقی، سماجی، سیاسی یا جنگی ضابطے میں موجود نہیں ہیں۔ صرف دنیائے فلسفہ میں ان کی تلاش کی جا سکتی ہے اور دنیائے فلسفہ کی کشش ثقل محبت ہے۔ ایروس (Eros) ہے۔ چونکہ محبت انسان اور خدا کے درمیان رابطہ کی ایک شکل ہے بلکہ واحد ذریعہ ہے۔ اس لئے ان سوالات کے جوابات صرف محبت کا مسافر ہی دے سکتا ہے اور بڑے اطمینان سے یہ کہہ سکتا ہے۔

میں تو اپنے آپ سے ہوں جدا

مجھے ڈھونڈتا ہے ترا پتا

میری تجھ سے ہے، یہی التجا

مجھے اپنے آپ سے دے ملا

کیونکہ وہ بلا تامل یہ بھی کہہ سکتا ہے۔

تیار ہوں میں کر دو قلم انگلیاں میری

جو دل میں قرطاس پہ بکھرے گا وہ اک دن

جذبات کی آندھی تو اڑا دیتی ہے سب کچھ

اور دل میں لگی آگ بھڑک جاتی ہے کچھ اور

ہوں کتنی میں بے بس کہ نظر آتا ہے سب کچھ

مظلوموں کے چہرے پہ سجی ظلم کی تصویر

وا ہوتی ہے اخبار میں میرے لئے ہر روز

براق لباسوں میں ہیں ملبوس سیاہ دل
انسان کے لاشے کو یہاں روند رہے ہیں

وسعت نظر کی چکا چوند نے محبت کے مسافر کو اب بوکھلا دیا ہے، وہ ابھی بھی یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ ابتدائے سفر میں ہی ہے اور یہ پوچھ رہا ہے۔

میری سوچوں پہ پہرے ہیں زباں میری بھی اب چپ ہے
میں اس افکار کی یورش کو لے کر اب کہاں جاؤں

موسم اعصاب شکن محسوس ہوتا ہے' ہوتا نہیں ہے۔ یہ احساس تھکاوٹ ہے جو اعصاب شکن ماحول کا سماں پیدا کر دیتا ہے اور مسافر کے اندر بسے ہوئے انسانوں سے یہ توقع اس کی روح میں جاگزین کر دیتا ہے کہ وہ اس کا کرب، بانٹ لیں گے۔ دو چار گھڑی اسے تھام لیں گے۔ اس کی آنکھوں میں موجود روشنی کو دوبالا کر دیں گے۔ حالانکہ محبت کا مسافر تو تنہا ہی ہوتا ہے اسی طرح جس طرح شہناز مزمل تنہا ہیں اور کہتی رہتی ہیں

اب تو دنیا کے سنگ رہتی ہوں
غم زمانے کے ہنس کے سہتی ہوں
جو بھی کہتی ہوں خود سے کہتی ہوں
کوئی حسرت نہ کوئی ارمان ہے
آج کچھ اس طرح سے جیتی ہوں
کہ

خوش آگئی ہے وحشت تنہائی خونبار
اس کنج قفس کو تو نہ چھیڑو کوئی مجھ سے
میں وارث زنداں ہوں مجھے کوئی تو حق دو

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ محبت کا سفر بارش کے پانی میں کاغذ کی کشتیاں بہانے اور ریت کے گھروندے بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ محبت کے مسافر کا بچپن بیتتا ہے۔ جوانی رت آجاتی ہے۔ اس رت میں وہ پریم کی بھاشا سیکھتا ہے۔ کبھی مسکراتا ہے، کبھی آنکھوں میں پانی بھر لیتا ہے اور جب آنکھوں میں پانی مچلتا ہے تو اسے ارد گرد کا ماحول بھی بھیگا دکھائی دیتا ہے جیسے بارش میں کار چلانے والے کو وائپرز چلانے کے بعد سامنے کا منظر نظر آتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اس سے کبھی گھر چھوٹتا ہے کبھی انگنائی۔ ایک دم چھلانگ لگا کر وہ ان گلیوں میں آجاتا ہے جن کے آگے صحرا ہے۔ اسے شعور نہیں ہوتا کہ ان گلیوں کا سفر طے کرنے کے بعد وہ صحرا میں کھو جائے گا۔ وہ صحرا میں کھو جاتا ہے۔ وہ خواہش کرتا ہے کہ ان گلیوں میں وقت کا پھیرا واپس ہو مگر وہ جانتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس کی محبت

(Sublimated) ہو جاتی ہے اور وہ افتخار امام کا ہمنوا ہو کر یہ کہنے لگتا ہے۔

محبتوں کی پرکھ کا یہی تو رستہ ہے
تیری تلاش میں نکلوں تجھے نہ پاؤں میں

وہ گلیاں وہ گھر وہ انگنائیاں لمبے سفر میں روشنی کے ایسے مینار بن جاتے ہیں جو پیچھے رہتے جا رہے ہیں۔ مسافر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ غم جاناں غم دوراں میں بدلتا جا رہا ہے۔

شہناز مزمل نے یہ سفر ضرور طے کیا ہو گا اور انہوں نے لازماً اپنے ساتھ ہمسفروں کو یہ بتایا ہو گا کہ وہ اپنے خدا سے رجوع کریں اور اسے اپنے خدا سے لگن لگانے دیں۔ لوگوں نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی ہو گی کہ منازل طے کرنے کی یہ بنیادی شرط ہوتی ہے۔

"عکس دیوار پہ تصویر" میں اس امر کا ثبوت موجود ہے۔ شہناز تنہا مسافر ہے جو بہت سی منازل طے کر کے اب ایسے مرحلہ میں داخل ہو گئی ہیں۔ جہاں اردگرد ان کے اپنے ہی قد کے آئینے نصب ہیں۔ جہاں مجبوریاں انسانوں کو فرشتے بناتی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں میکدے میں وہ تشنہ کام آتے دکھائی دیتے ہیں جو زہد کے صحرا کے مسافر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جہاں موسم کے عذاب سفر کا لازمہ دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں لفظوں کے سوداگر سعیِ بیکار میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جہاں نہ تو سورج کو مرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے نہ اس کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ جہاں راہیں سمٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جہاں خوف نارسائی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جہاں سڑک کے پتھر بھی مقدر کے دیوتا نظر آتے ہیں۔ جہاں عدل کی میزان قاتل کی جانب جھکتی دکھائی نہیں دیتی۔ جہاں برسوں کا رت جگا شب وصل میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بے مہری بے معنی اصطلاح بن جاتی ہے۔ جہاں سچ بولنے والوں کو رفعتیں دار پہ لے جا کر نہیں بخشی جاتیں۔ ہوا یہ ہے کہ شہناز تمام ظاہری حقائق کی اصلیت سے شناسا ہو گئی ہیں۔ انہوں نے محبت کا سفر طے کر لیا ہے اور "عکس دیوار پہ تصویر" کے حوالے سے وہ فلسفے کے قلب کی وارث بن گئی ہیں۔ جسے صرف ایک نام دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے "محبت"۔ مجھے کہنے دیجیے کہ "عکس دیوار پہ تصویر" حدیث محبت ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان قوس قزح بن کر رابطے ہموار کرنے کی طرف ایک جامع کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔

# شہناز مزمل صاحبہ کی شخصیت اور کلام پر ایک طائرانہ نظر

موسیٰ کلیم نظامی

میں نہ تو نقاد ہوں۔ نہ محقق نہ مدقق۔ ایک عام سا قاری ہوں۔ جو میں پڑھتا ہوں یا سنتا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بھلا میں کیا محترمہ شہناز مزمل کے کلام پر تنقید یا تقریض کر سکتا ہوں۔

ایک بار کسی موقع پر ڈاکٹر ٹیگور نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ جہاں میرے خیال کا پرندہ آ کر رک جاتا ہے وہاں سے نذر الاسلام کا طائر خیال پرواز کرتا ہے۔ اتنے بڑے مفکر کا یہ کہنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے نذر الاسلام کی شاعری کو اس کا جائز مقام دینے کی کوشش کی ہے۔ ٹیگور کے ان الفاظ کو مستعار لیتے ہوئے اگر میں یہ کہنے کی جسارت کروں کہ شہناز کا طائر خیال بھی وہاں سے اڑنے کے لئے پھڑپھڑاتا ہے جہاں پر ہم جیسے بہت سے شاعرو شاعرات کے طیور تخیل شاخ گلشن شاعری پر دم لینے کے لئے رک جاتے ہیں۔ اس سے میری مراد کسی کی تذلیل و توہین نہیں بلکہ ان اجارہ داروں کو احساس دلانا ہے جو کیٹس، ٹینی سن یا بائرن کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر اپنا قد بلند کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور بے خودی میں یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی ہے جو حقیقت حال سے واقف ہے۔

اول اول میرا خیال تھا کہ شہناز کی شاعری بھی عام سی شاعری ہو گی جو بعض خواتین و حضرات اپنا شوق پورا کرنے اور ذہنی آسودگی کی خاطر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ لیکن جب ان کے کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے آپ بیتی میں جگ بیتی مدغم کر دی ہے۔ بظاہر وہ اپنے دکھ کی بات کرتی ہیں لیکن بباطن ان کا دکھ کرب رنج و غم سارے معاشرے کا رنج و الم ہیں۔ اور گر میں یہ کہوں کہ تمام بنی نوع انسان کا الم ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ دراصل ہر حساس مفکر تمام خارجی مظاہر کو اپنی ذات ہی کے حوالے سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔

یہ شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ مسلمہ حقیقت ہے کہ شہناز مزمل صاحبہ کے دماغ میں خیالات کا ایک سمندر موجزن نظر آتا ہے اور جب وہ موجیں طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو سمندر کی تہہ میں جو سیپ اپنے اندر موتی چھپائے ہوئے ہیں وہ ساحل پر آ کر بکھر جاتے ہیں۔ یہ ان سیپوں میں سے موتی نکال کر شعروں کی لڑی میں پروتی ہیں۔ ان موتیوں کو پرکھنا کہ بیش بہا ہیں یا نہیں جو ہریوں کا کام ہے اور جوہری بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو لعل و گہر کے اصلی اور بیش بہا ہونے کا فہم و ادراک رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو صرف روایتی طور پر یہ جانتے ہیں کہ ایسا رنگ ایسی چمک ہو تو اصلی ہے ورنہ نقلی، حالانکہ بسا اوقات ان کا مفروضہ غلط ثابت ہوتا ہے۔ آپ جوہری ہیں ان کے شعر میں پروئے ہوئے موتیوں کو پرکھیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کتنے بیش بہا ہیں۔ وہ خیالات کو کس طرح الفاظ کا جامہ

پہنا کر پیکر گویائی بنادیں ہے۔

قدرت نے شہناز کو قدرت فکر احساس وادراک کے ساتھ ساتھ زبان کی شیرینی اور لہجہ کی ہم آہنگی بھی عطا کی ہے۔ ان کی شاعری بیک وقت حالات حاضرہ کی ترجمان بھی ہے اور عصری تقاضوں کو پورا بھی کرتی ہے۔ گو ان کی آواز جنس لطیف ہونے کے ناطہ نسوانی ہے لیکن بے معنی نہیں۔ ان کی آواز میں محبت ہے درد ہے مجبوری ہے دکھ ہے۔ بے کسی و بے بسی ہے لیکن ناامیدی نہیں۔

ان کے اظہار میں جان اور لہجہ میں دلکشی ہے۔ ان کی آواز کوئی صدائے صحرا نہیں بلکہ ایسی آواز ہے جو گنبد شاعری میں ہمیشہ اپنے منفرد انداز میں گونجتی رہے گی اور سامع کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی کبھی نرم اور شیریں لہجہ میں اور کبھی دکھ بھرے دلگداز انداز میں۔ شہناز کی شخصیت غزلوں اور نظموں میں یکساں منعکس ہوئی ہے جو اچھی شاعرہ ہونے کی دلالت کرتی ہے وہ نظم اور غزل کہنے میں یکساں مہارت رکھتی ہیں۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا صریحاً ان سے ناانصافی ہوگی۔ نظم لکھنے کا انداز ٹیگور جیسا فلسفیانہ ہے۔ جس میں گہرائی بھی اور گیرائی بھی۔

ان کے کلام میں غیر مانوس استعارے اور تشبیہیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ الفاظ و تراکیب میں روائتی کہنگی نہیں ہے بلکہ جدت آمیز نغمگی ہے۔ انہوں نے جہاں روایتی غزل گوئی سے اپنا دامن بچایا ہے وہاں جدید غزل گوئی کو اپنے مقام پر رکھا ہے۔ حد سے بڑھنے نہیں دیا۔ اپنے کلام میں قدیم و جدید غزل کی خوبیاں موجود ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ اپنی ذات کے حوالے سے انسانوں کی اجتماعی نفسیات کی طرف بڑے بلیغ اشارے کر جاتی ہیں۔

حجاب کا یہ عالم کہ وہ پردہ نہ کرتے ہوئے بھی باپردہ ہیں۔ کسی محفل میں وہ بیٹھی ہوئی ہوں تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ بے پردہ ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ہروقت حجاب کا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ خاموش طبع کم گفتار اور باکردار' لوگوں کی چہ میگوئیوں سے بے نیاز' بڑوں کی عزت' چھوٹوں سے شفقت ان کا خاصہ ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ کیوں بعض اوقات اپنے سے ذرا کم عمر مرد و خواتین کو بھی بیٹا یا بیٹی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں لیکن جب میں نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو یہ راز مجھ پر کھلا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ہمدرد اگر کوئی ہستی ہے تو وہ ماں ہے۔ ماں اپنے بچہ کا کوئی دکھ کوئی درد کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی وہ اپنے بچہ کی خوشنودی کے لئے مشکل سے مشکل ترین حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے۔ وہی ماں کا جذبہ ایثار انہیں بیٹا یا بیٹی کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

انہیں خلق خدا سے محبت ہے لیکن کسی طور بھی وطن کی قیمت پر نہیں رہا معاملہ مذہب کا تو یہ کہوں گا کہ ان کے مذہبی ہونے میں کسے انکار ہے۔ ان کا طور طریق' بود و باش سب اسلامی معاشرہ کی آئینہ دار ہے۔ یہ بیک وقت نیک بیوی' پرخلوص اور مشفق ماں' حلیم الطبع منتظم' بہتر مصنف اچھی ادیبہ اور پایہ کی شاعرہ ہیں۔ ہاں میں تو یہ بھول ہی گیا کہ یہ بہترین مقرر بھی ہیں۔ ابھی میں نے جو اوصاف بیان کئے یہ سب مل کر ایک شہناز مزمل بنی ہیں۔

چند نمونہ کلام ملاحظہ ہوں۔

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کمال سے گزر گئی
رہے فاصلے میرے منتظر میں تو جسم و جاں سے گزر گئی

شکستہ آئینہ خانوں میں عکس کس کے ہیں
یہ راز کیسے کھلے انکشاف کیسے ہو

سبز رت میں گلاب جھلسے ہیں
بیتے موسم کا زخم گہرا ہے

خالی کشکول تھا پھر بہ نہ بڑھا دست سوال
تو نے جانا ترا سائل کوئی سودائی ہے

گھاؤ کس کس سے ملے ہیں نہ کوئی جان سکے
اب مجھے اپنی نگاہوں سے بھی چھپنا ہو گا

کوئی لمحہ اگر بچا ہو گا
دامن وقت پہ سجا ہو گا

گردش دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں

ساتھ ہے اک جہاں تخیل کا
لفظ بن کر زباں میں رہتی ہوں

خود کو پانا ہے ناممکن
منزلوں کے نشاں میں رہتی ہوں

چاندنی زرد ہے وحشت ہے فضا میں شہناز

کون ٹھہرے گا یہاں شہر ہے ویراں جاناں

بدلنے کو لہجہ و زباں ڈھونڈتی ہوں
میں لفظوں میں کنج اماں ڈھونڈتی ہوں

کب تلاشے ہیں میں نے سنگ میل
چلتے رہنا میرا مقدر ہے

سماعتوں پہ میری آج کیسی دستک ہے
کوئی ہوا سے پتا میرا پوچھتا ہو گا

نفس نفس میں کوئی آشکار ہوتا ہے
جو میرے دل کے قریں ہے میرا خدا ہو گا

بہت ٹکرائے ہیں اپنی انا کے پتھروں سے ہم
مگر گرتی ہوئی دیوار سے ماتھا نہیں پھوڑا

میرے ہر لفظ میں تحریر میں تو ہی تو ہے
توڑ ڈالوں نہ قلم آج ترے نام کے بعد

کھلے دریچوں پہ دستک ہوا نہیں دیتی
سماعتوں پہ کبھی اعتبار مت کرنا

وہ شب گزیدہ مسافر بھٹک نہ جائے کہیں
سحر قریب ہے کوئی اسے خبر کر دے

# مٹی

مٹی لے کے ہاتھ میں اپنے
کب سے بیٹھی سوچ رہی ہوں
میں بھی مورت مٹی کی ہوں
مجھ کو ڈھالا رب نے میرے
میں یہ مٹی کیسے ڈھالوں
کوزے ڈھالوں
بابت ڈھالوں
گھر میں لگواؤں
گور بناؤں
مٹی یہ بھی
مٹی میں بھی
کیوں نہ اب میں دور کی سوچوں
مٹی کھیلوں مٹی پہنوں
اور مٹی ہو جاؤں

# "موم کے سائباں" کی شاعرہ شہناز مزمل

تحریر:۔ غفار بابر۔ڈیرہ اسماعیل خان

دلوں کی حرارت سے کھیلنے والی موم کے سائباں کی شاعرہ شہناز مزمل اپنی جرات اظہار سے کام لیتے ہوئے عکس دیوار پہ تصویر جذب و حرف بنانے کا فن خوب جانتی ہے۔ اگر یہی سلسلہ بدستور جاری رہا تو ایک دن ضروری اس کی ادھورے خواب مکمل ہو کر خوبصورت تعبیر میں ڈھل جائیں گے۔ اور پھر وہ پیام نو کو ایک نئے عزم کے ساتھ زمانے میں عام کر دے گی۔ اور یہی شوق جنوں اسے فلک کی رفعتوں سے لامکاں کی سرحدوں تک لے جائے گا اور پھر ایک آواز آئے گی۔

میرا شوق تھا میرا ہم سفر، تھی بلندیوں پہ میری نظر
نہ زمیں کی قید میں رہ سکی ہر اک آسمان سے گزر گئی

مجھے راستوں کی خبر نہ تھی، اڑی خاک میرے وجود کی
میں تلاش کرتی ہوئی، تجھے تیرے لامکاں سے گزر گئی

شہناز مزمل ان قافیہ پیماؤں میں نہیں ہیں جو پورے پورے دیوان میں محض ایک دو شعر رواں نکال کر شاعر بن جاتے ہیں بلکہ اس کا اپنا ہی جذبہ شعری اور اظہار و بیان اتنا بالغ و راسخ ہو چکا ہے کہ ایک پوری اور قدرے طویل غزل میں یہ جذبہ و اظہار ہمواری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔ شہناز کے یہاں جگہ جگہ ایک والہانہ شوق، رندانہ جوش اور سرمستانہ کیفیت ملتی ہے جو ان کے غایتی میلان کے منافی بھی نہیں اور کلام کی فنی سطح کو بھی اوپر اٹھاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں غزل کی صنف کو اپنانا اور معقولیت و معنویت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے غزل سرائی کا تہیہ کرنا ہی کیسی کچھ جگرداری کا کام ہے پھر اس میں فکری و نظریاتی شعور کی ترجمانی کا اضافہ اس رستے کو جتنا دشوار بنا دیتا ہے اس کا تصور بھی شاید ہر شخص کے لئے ممکن نہ ہو گا۔ لیکن شہناز اس تصور میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہوئے ان تمام مشکلات سے بڑی کامیابی سے گزر جاتی ہے۔

مل ہی جائے کسی تعبیر کو شاید اک خواب — عکس دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے
ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کیلئے — ریت کے گھر پہ بھی دیوار اٹھا دی ہم نے
ہم اسیران انا، تشنہ لب بام گئے — بازی زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے

دم رخصت اسے جینے کی دعا دی ہم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلا دی ہم نے

مستقبل کی خوبصورت آس کے ساتھ جہد مسلسل پر یقین رکھنے والی پر اعتماد شاعرہ شہناز مزمل

کے خیال میں زمانے کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ تحقیق اور مشاہدے میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ اذہان جتنے تحقیق کی طرف مائل ہوں اتنے ہی باریک بین ہو جاتے ہیں اور اسی قدر خوبصورت ادب بھی تخلیق ہوتا رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فی زمانہ دانشور جدید دور کے نئے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے ہیں جو یقیناً ایک خوش آئند رجحان اور مثبت کاوش ہے۔

شہناز نے زمانے بھر کے دکھوں کو ذاتی دکھ سمجھ کر اپنی شاعری میں سجایا ہے۔ کرب انسانی کا یہ اظہار انسان کو یاسیت سے آشنا نہیں کرتا بلکہ سماج اور حالات کے خلاف جدوجہد پر اکساتا ہے اور اپنے دکھوں اور غموں کے پس پردہ عوامل ..... آزما ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری ہر دکھی انسان کے دل کی دھڑکن بن گئی ہے۔ عکس دیوار پہ تصویر کشی کرتے ہوئے شہناز کہتی ہے۔

میرا مذہب ہے محبت' میرا مشرف ہے وفا
خامشی ہے میری احساس ادب کی شاہد
وفا پرست نہیں جو وفا شعار نہیں
سوائے درد کے کوئی نہیں میرا مونس
کھا کھا کے زخم خون سے بھر لی ہیں انگلیاں
انصاف سے بتا ذرا دکھ درد کے سوا
ہوں وقت کی دہلیز کا میں آخری لمحہ
بے رحم حقائق کی کڑی دھوپ ہمیشہ
خوشبو ہو تم فضا میں بکھر کے تو دیکھنا
کیا کچھ چھپا ہوا ہے خلائے بسیط میں

دشمنوں سے بھی ہے اپنوں کی طرح پیار مجھے
کون کہتا ہے نہیں جرات اظہار مجھے
وہ شخص کیا جسے انسانیت سے پیار نہیں
سوائے غم کے کوئی میرا غم گسار نہیں
جو خار تیری راہ میں پایا' ہٹا دیا
شہناز کو تری محبت نے کیا دیا
ٹوٹے ہوئے تاروں سے صدا آتی رہے گی
وجدان تو کیا روح کو جھلساتی رہے گی
ہمراہ موسموں کے سنور کے تو دیکھنا
اس کرب آگہی سے گزر کے تو دیکھنا

شہناز مزمل کے ان اشعار سے یہ صداقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسے انسانیت سے پیار ہے۔ اس کی شاعری میں مقصدیت کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کے لئے ایک عالمگیر پیغام موجود ہے۔ وہ دکھی انسانیت کو جدوجہد کا پیغام دینا چاہتی ہے تاکہ ان کے مصائب کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ شہناز کا پیغام جغرافیائی حدود سے بالاتر ایک آفاقی پیغام ہے جو ظلم و تعدی اور جبر و تشدد میں صبح خنداں طلوع ہونے کی نوید سناتا ہے۔ شہناز مزمل کی شاعری ان کی ذاتی زندگی کی عکاس اور ترجمان ہے۔ اس کا احساس محرومی ان کی شاعری میں اداس لمحوں کے تجربات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کی زندگی جن نشیب و فراز کی داستان ہے وہی اس کی شاعری کی پہچان ہے۔ "عکس دیوار پہ تصویر" اور "موم کے سائبان" کی شاعرہ شہناز مزمل اپنی شاعری میں زندگی کی شام یاسیت کو صبح نو کا امید بھرا مژدہ سناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

زمانے بھر [illegible] سب نے — ملے گی جب بھی زباں، آسمان بولے گا
چراغ جاں ہے فروزاں ہتھیلیوں پہ تری — ہوا کا جھونکا مری داستان بولے گا
شب تاریک میں کس جا پہ بسیرا کر لوں — ہر گھروندا ہی یہاں ریت کا لگتا ہے
راہ تاریک ہے، منزل کا نشاں دھندلا ہے — کرنک شب بھی مسافر کو حضر لگتا ہے
ڈوبتی شام کا سایہ ہوں میں ڈھل جاؤں گی — تیری دنیا سے کہیں دور نکل جاؤں گی
تو نے جو آگ میرے دل میں فروزاں کی ہے — صورت شمع اسی آگ میں جل جاؤں گی
آج اپنی دعاؤں میں اثر دیکھ رہی ہوں — میں شام مقدر پہ سحر دیکھ رہی ہوں
آسوں کے بجھے دیپ جلا کر میرے باسط، — جانب میں تیری یار دگر دیکھ رہی ہوں
دیے میں انا کے جلانے لگی ہوں — میں سورج نیا ساتھ لانے لگی ہوں
ہواؤں کے رخ پر سفینے بہا کر — میں بجھتا دیا پھر جلانے لگی ہوں

جل رہی ہوں کب سے اے شہناز اپنی آگ میں
رنگ لائے گی میری شعلہ نوائی دیکھئے

میں ہوں بر دوش ہوا، ہمت نہ میری آزما — یہ ہوا سرکش دیا بھڑکائے اس کی کیا مجال
ظلمت شب کی دریدہ دامنی تھی دیدنی — ڈھونڈتی تھی ڈوبتی کرنوں میں صبح بے مثال

(عکس دیوار پہ تصویر)

---

منزلوں کی جستجو میں ڈھونڈتے ہو کیا چراغ — راہ میں کیوں جگنوؤں کے گھر نظر آتے نہیں
سیاہ شب میں ڈسے جب بھی کرب تنہائی — چراغ یاد کے دل میں جلا لیا کرنا
سورج کے نکلنے کی خبر مجھ کو بھی کرنا — ظلمت کدہ شب میں تو ٹھہرا نہیں جاتا
روشنی کی بھیک کیوں مانگوں کسی سے آج میں — رقص ہے شعلوں کا پر شبہات ہی کچھ اور ہیں
بعد مدت کے چراغاں سا میرے دل میں ہوا — کوچہ شہر تمنا کو سجایا جائے
وہ شب گزیدہ مسافر بھٹک نہ جائے کہیں — سحر قریب ہے کوئی اسے خبر کر دے
ظلمت ہستی کے زنداں میں رہے شہناز قید — ہمسفر کو ہم اجالوں کی خبر کرتے ہیں

(موم کے سائباں)

شہناز مزمل کے نزدیک افادی پہلو کے بغیر ادب کو ادب تسلیم کرنا ادب کی بے ادبی ہے۔ جب تک مشاہدے میں گہرائی پیدا نہیں ہوتی فکر میں گہرائی کا پیدا ہونا محال ہے۔ چشم بینا اور نور بصیرت کو بروئے کار لا کر جو ادب تخلیق کیا جائے گا وہ بلا شبہ افادیت کا حامل ہو گا۔ آزاد اور نثری شاعری کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ شاعری شاعری ہے اور نثر نثر، دونوں انفرادی طور پر مقبول بھی ہیں۔ مگر

دونوں کی حیثیت جداگانہ ہے۔

معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے مختلف النوع واقعات سے متاثر ہو کر مختصر کہانیاں لکھنے والی شاعرہ شہناز مزمل نظم میں بھی غزل کا آب و رنگ پیدا کر دکھاتی ہے۔ وہ فکر و خیال میں بصیرت اور لفظ و بیان میں ندرت کی قائل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے ہر صنف شعر پر پوری پوری دسترس حاصل ہے۔ خصوصاً نظم سے اس کا لگاؤ بہت گہرا ہے۔ لیکن غزل کو بھی وہ محبوب جانتی ہے اور اس میں خوب کھل کر اپنی جودت طبع کے رنگ نکھارتی ہے۔ اس کی طبع رسا نے بیشتر اصناف سخن میں فکر و فن کے خوبصورت نقش ابھارے ہیں۔ آزاد نظم کے علاوہ غزل میں بھی وہ جس شغف اور سپردگی کے ساتھ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتی ہے، اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ شہناز کی غزلوں میں غم جاں کی کسک بھی ہے اور غم جہاں کا تردد بھی۔

بقول کسے غزل کی شاعری بظاہر آسان معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً آسان ہوتی نہیں۔ دیگر اصناف شعری کے مقابلے میں اس کا تجزیہ کرنے سے اس کی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی مثل اس پر خوب صادق آتی ہے۔ کسی خیال، احساس یا جذبے کو ایک شعر میں اس جامعیت کے ساتھ بیان کر دینا کہ اس کی پوری معنویت بھرپور اثر کے ساتھ واضح ہو جائے کوئی آسان کام نہیں۔ شہناز نے بلاشبہ اس کام کی دشواریوں پر بڑی حد تک نہایت ہنرمندانہ طور پر دسترس حاصل کی ہے۔ اس کی غزل آج کی عام غزل سے مختلف اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتی ہے۔ اس کی شاعری میں فکر و خیال کی تازگی اور اسلوب میں نیا پن موجود ہے۔ انسانیت کے فروغ، امن و آشتی اور مظلوم سے ہمدردی کا جذبہ اس کی شاعری میں بھینی مہک کی طرح رچا بسا ہوا ہے۔ ثبوت کے طور پر شہناز مزمل کے تازہ مجموعہ کلام "موم کے سائبان" کی غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر قاری کو اس بات کا پورا پورا یقین اور باور آجائے گا کہ نئے شعور سے مزین ایک پختہ شاعرہ اردو شاعری کی اقلیم میں در آئی ہے۔

---

اسیر ذات رہے، اعتراف کیسے ہو
خود اپنے آپ سے کچھ انحراف کیسے ہو

فصیل شہر کو خود اپنے ہاتھ سے توڑا
نقیب وقت سے اب اختلاف کیسے ہو

کرب تنہائی بتا تجھ کو چھپاؤں کیسے
لوٹ کر جانا بھی چاہوں تو میں جاؤں کیسے

نوک مژگاں سے چنوں بکھرے ہوئے رنگ سبھی
ریت ساحل پہ جو بکھری ہے اٹھاؤں کیسے

سرمئی شام ہے، سناٹا ہے، تنہائی ہے
کیسی بے چینی میری روح میں در آئی ہے

گھیرے رکھتا ہے مجھے کرب مسلسل کا حصار
غم دوراں، غم جاناں سے شناسائی ہے

کوئی منظر، کوئی تصویر نہیں بنتی ہے
مجھ سے خود اپنی ہی تقدیر نہیں بنتی ہے

جاگتی آنکھوں میں [illegible] آباد ہے
اور کسی خواب کی تعبیر نہیں بنی ہے

ڈھونڈنے نکلی تھی میں درد کا درماں جاناں
راستہ پایا ہر ایک شعلہ بداماں جاناں

عمر گزری ہے میری عرصہ تنہائی میں
اور سہہ سکتی نہیں وحشت زنداں جاناں

ساتھی سارے چھوڑ گئے ہیں' بیگانوں میں کھو جاؤ
دیوانوں کی بھیڑ لگی ہے' دیوانوں میں کھو جاؤ

شمع کے سنگ موم ہوئے تو قطرہ قطرہ بہہ جاؤ گے
اپنی آگ میں جلنے والو' پروانوں میں کھو جاؤ

---

شہناز کی چھوٹی بحروں میں غزلیں بھی لاجواب ہیں۔ اسے تھوڑے لفظوں کو شعر کے پیکر میں ڈھالنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ چھوٹی اور مترنم بحروں میں میر کی طرح کم سے کم اور سادہ سے سادہ الفاظ میں جذباتی کیفیت کی عکاسی شہناز کے کلام کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ غم اور تنہائی کا احساس اس کے فن میں موسیقی کی لہریں پیدا کر دیتا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

زرد رت کا فضا پہ پہرا ہے
موسم گل کہاں پہ ٹھہرا ہے

سبز رت میں گلاب جھلسے ہیں
بیتے موسم کا زخم گہرا ہے

کتنا گہرا تھا زخم' چھوڑو بات
زخم تھا زخم بھر گیا ہو گا

اے غم دہر' سانس لینے دے
ختم کب تیرا سلسلہ ہو گا

گردش دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں

اب بھنور کا نہیں ہے ڈر شہناز
دائروں کے جہاں میں رہتی ہوں

میں خود سے کیا کیا فرار چاہوں
سکون مانگوں' قرار چاہوں

مجھے بھی کچا گھڑا ملا ہے
اترنا دریا کے پار چاہوں

زندگی کا حصار مشکل ہے
موت کا انتظار مشکل ہے

لاش اپنی اٹھا کے چلنا تو
ہمسفر بار بار مشکل ہے

---

شہناز مزمل کا کلام خلوص و دردمندی کا مرقع ہے۔ شہناز دور حاضر کی وہ واحد شاعرہ ہے جس کی شاعری میں موضوعات اور اسالیب کا بلند معیار ایسی حیرت انگیز یکسانیت رکھتا ہے کہ قاری بوکھلا کر رہ جاتا ہے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس کس نظم کو بلند معیاری کی سند عطا کرے۔ "موم کے سائبان" کی ہر نظم ایک نمائندہ نظم ہے۔ جرم آگہی کڑی سزا' رتجگوں کی مسافت' بے کلی' شب گزیدہ' سرو سناٹا' منتظر آنکھ' کربلا کے نام' اجنبی سرزمین' شکستہ آئینے اور سوال تو ایسی نظمیں ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ نظم برزخ احساس کے چند شعر دیکھیے۔

عکس پنہاں ہے تیرے شہر کا ان آنکھوں میں

جاگتی آنکھوں میں سپنے ہیں سجائے میں نے

میں ہوں سودائی مجھے برزخ احساس میں آج

اپنی ہر ایک تمنا کو جلانا ہو گا

تجھ سے تجدید محبت کا تقاضا کیا

اپنا ہر نقش مٹا کر تجھے پانا ہو گا

مختصر ترین نظم "لمحہ تخلیق" ملاحظہ ہو۔

تخیل کی نئی پرواز ہو گی

فضا میں اک نئی آواز ہو گی

کوئی دہلیز پر آکر رکے گا

شہناز مزمل کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق ہے۔ اس کی شاعری اور فکر و نظر کے زاویے عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تپش سے نکھار حاصل کرتے ہیں۔ نعتیہ کلام کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرم یہ رحمت رب الانام کر دینا عطائے جلوہ دارالسلام کر دینا

پیام اذن حضوری ملے مجھے جس دم زباں پہ جاری محمدؐ کا نام کر دینا

تیری ہی یاد میں شہناز کی یہ عمر کٹے دعا قبول یہ خیر الانام کر دینا

کیوں کوچہ جاناں سے اشارہ نہیں آتا

مجھ کو در طیبہ سے پکارا نہیں جاتا

ہوں گوش بر آواز ملے اذن حضوری

دکھ دوری طیبہ کا سہارا نہیں جاتا

---

شہناز مزمل نے والد کی وفات کے بعد ۱۹۸۶ء سے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز کیا۔ شعری ادب کے ساتھ ساتھ وہ نثر بھی لکھتی ہے۔ اس وقت اس کے پانچ شعری مجموعوں (پیام نو' جذب و حرف' جرات اظہار' عکس دیوار پہ تصویر' موم کے سائباں) کی علاوہ پانچ نثری کتابیں (کتابیات اقبال' کتابیات مقالہ جات' فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار' لائبریریوں کا شہر لاہور (گائیڈ بک..) نماز (بچوں کے لئے) بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ جبکہ چھٹا شعری مجموعہ "میرا خواب ادھورا ہے" کے نام سے طباعت کے مراحل میں ہے۔

شہناز مزمل پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے لائبریری سائنس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد

گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور میں بحیثیت بانی چیف لائبریرین کے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈی ایچ ایم ایس پنجاب اور فرانسیسی زبان، کمپیوٹر، انتظامی امور اور سائنٹفک مینجمنٹ کے شارٹ کورسز بھی کر چکی ہیں۔

ملتان ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والی پہلی نسوانی آواز شہناز مزمل کی تھی۔ اس وقت وہ بہت سی علمی، ادبی، اور سماجی انجمنوں کی رکن، صدر اور چیئرپرسن بھی ہیں۔ ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور گورنر پنجاب سے ادبی ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہے۔

شہناز مزمل غالب، اقبال اور ن م راشد کی شاعری سے بے حد متاثر ہے۔ آج کل کے شعری ادب سے مطمئن ہونے کے ساتھ ساتھ اسے "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں"۔ شہناز مزمل اپنے ادبی سفر کے بارے میں خود رقم طراز ہے۔ "میرے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز والد صاحب کی وفات کے بعد ہوا۔ والد مرحوم حشر القادری خود شاعر تھے۔ گویا شاعری ورثے میں ملی۔ حضرت علامہ اقبال سے متاثر تھی تو پہلی کتاب اسی طرز پر پیام نو کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن لائبریریوں تک محدود رہا۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو جذبوں نے حرف پہنے اور جذب و حرف، کا پیکر سامنے آیا۔ تو پھر جرات اظہار کا قرینہ بھی آ گیا اور یوں جذب و حروف اور جرات اظہار کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئیں اور اس کے بعد آنے والے مجموعے کے لئے "میرا خواب ادھورا ہے" کا اعلان کیا گیا۔ مگر خواب ادھورا رہا اور "عکس دیوار پہ تصویر" بن گئی۔ "موم کے سائبان" شہناز مزمل کا تازہ ترین مجموعہ کلام ہے۔ جس پر مختلف ادیبوں اور دانشوروں نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔

بقول منیر نیازی "معاشرے میں کوتاہیوں اور بگاڑ کا احساس، ایک بڑے آدرش اور اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستگی، مذہب اور وطن سے محبت، مثالی بود و باش کی خواہش، ایک نامہربان آس پاس میں ایک غمگسار اشارہ۔ یہ ہے شہناز مزمل کی شاعری خوبصورت مستقبل کی آس کے ساتھ"۔

انیس ناگی کی رائے میں "شہناز مزمل کی نظمیں جو جذباتی سطح مرتب کرتی ہیں ان میں معاصر ناہموار زندگی کی رنگت اور فرد کی مجبوری کا عکس دکھائی دیتا ہے"۔

روحی کنجاہی کے نزدیک "شہناز مزمل کے کلام کا سب سے نمایاں وصف اظہار کی سچائی اور بے ساختہ پن ہے۔ وہ لفظی بازیگری اور تکلفات کی قائل نہیں۔ اس کا کلام قاری کے دل و دماغ کو مدتوں اپنے حلقہ اثر میں رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے"۔

عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں "ہلکے رنگوں اور سردیوں کی دھوپ جیسی یہ شاعری قاری کو آسودگی کی منزلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ دکھوں کی تہذیب ہے اور میں شہناز مزمل کو اس ارفع رویے کی شاعری پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

ڈاکٹر اجمل نیازی کا کہنا ہے "شہناز شاعری کو بھی ایک اچھے گھر کا منظر دینا چاہتی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کی موثر موجودگی کسی اعزاز کی طرح ہے۔ بلاشبہ وہ ایک معزز شاعرہ ہے"۔

نذیر قیصر کی رائے کے مطابق "ان کی شاعری ہماری تہذیب کے کھنڈر سے طلوع ہوتی ہوئی کسی صبح کی مانند ہے۔ سچی اور خوبصورت"۔

کرامت بخاری کی نظر میں "وہ تو صرف اور صرف انسانیت کی شاعرہ ہیں اور یہی ان کی شاعری کا حسن ہے"۔ شہناز مزمل۔ ایک منفرد کائناتی شاعرہ کے عنوان سے سعد اللہ شاہ لکھتے ہیں۔ "اس شعری مجموعے میں شہناز مزمل نے بھرپور شاعری کی ہے اور وہ تخلیقی سطح پر ہر شعر کہنے کے لطف اور کرب کو ساتھ ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یقیناً وہ بڑی توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو ہم اس سے اچھی توقعات رکھتے ہیں"۔

"عکس دیوار ہے تصویر" میں شہزاد احمد کہتے ہیں۔ شہناز مزمل نے زندگی اور کتاب دونوں کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ فیصل حنیف کو شہناز مزمل کی شاعری دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے جبکہ منصور آفاق شہناز کو ایک دانشور مجاہدہ کہتا ہے۔

خلوص اور امن کی پیامبر محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل کی خوبصورت شاعری سے متاثر ہو کر راقم الحروف (غفار بابر) نے انہیں منظوم خراج عقیدت بعنوان "عقیدتوں کی مالا" پیش کیا ہے جو نذر قارئین ہے۔

کیا خواب جزیروں میں کہانی کا مزا ہے
ہر خواب میں تعبیر سہانی کا مزا ہے

کیا بات ہے شہناز مزمل کے قلم کی
تحریر میں کوثر کی روانی کا مزا ہے

تصویر محبت میں کئی رنگ بھرے ہیں
ہر رنگ میں بزاد کا مانی کا مزا ہے

پھولوں سے مہکتے ہوئے شعروں کا اجالا
تاروں کی قسم رات کی رانی کا مزا ہے

ہر مصرعہ تر ہے گل خنداں کا تبسم
ہر شعر میں انگور کے پانی کا مزا ہے

ہر بند ہے قند مکرر کی حلاوت
ہر لفظ میں کیا حسن معانی کا مزا ہے

انگشت بدنداں ہے زلیخائے محبت
اس چاہ میں بھی یوسف ثانی کا مزا ہے

ہر شعر میں ہیں حسن کی معصوم خطائیں
کیا جرم ضعیفی میں جوانی کا مزا ہے

بابرؔ وہ ملے گا نہ غزلوں کی غزل میں
شہناز کی جو زمزمہ خوانی کا مزا ہے

# روشن خیال شاعرہ

## حسن معزالدین قاضی

میں بھی انسان ہوں سینے میں دھڑکتا دل ہے ۔۔۔ آؤ کچھ کرب میرا آج ذرا بانٹ ہی لو
وقت کا کرب اکیلے ہی سہا ہے میں نے ۔۔۔ وقت کی گرد نے راہوں کو میری ڈھانپا ہے
ہم سخن بن کے میرا درد ذرا کم کر دے ۔۔۔ آگ بھڑکے نہ کہیں لو ذرا مدھم کر دے
گرمئ افکار کی بھٹی قیامت خیز ہے ۔۔۔ سوچ کے جنگل میں اب کے آگ بھی کچھ تیز ہے
دل میرا ہے وحشت شب میں گریزاں آج بھی ۔۔۔ یہ ہوائے درد تو شہناز اب مہمیز ہے

شہناز مزمل۔ جس کے لئے ہوائے درد ہی مہمیز ہے۔ آج رونق محفل ہے۔ یہ معروف شخصیت جب اپنے دفتر میں فروکش ہوں تو بزنس ایگزیکٹو لگتی ہیں۔ نپی تلی گفتگو' مطلب کی گفتگو' موضوع کاروبار سے سرمو انحراف نہ کرنا' کلائنٹ کا اور اپنا باہمی مفاد پیش نظر رکھنا' قطعاً" احساس نہ ہونے دینا کہ بزنس ایگزیکٹو صاحب درد اور حامل جذبات بھی ہو سکتی ہے۔ کجا یہ کہ وہ قادر الکلام شاعر بھی ہو اور صاحب درد ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دیوان بھی ہو۔

مجھے تعجب ہوا کہ جب ان سے اپنے دفتر میں ملاقات کے بعد ایک دوسری محفل میں ان کا تعارف بطور شاعرہ کے ہوا۔ پھر یہ تعجب ایک خوش آئند سرور میں بدل گیا۔ اللہ کا شکر کرتے ہوئے سرور ملا۔ کہ اب ہمارا سماجی مستقبل بہت روشن ہے کہ ہمارے معاشرہ میں سیکولر شاعر پیدا ہو گئے ہیں اور اللہ کی بارگاہ سے ہی یہ امید بھی افزا ہو گئی کہ اب ہمارے معاشرے میں سیکولر مولوی بھی نمودار ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔ سیکولرازم عہد حاضر کے مسائل سے عہدہ برہونے کا نام ہے۔

مذہب' اعتقاد' دین دھرم سے وابستہ رہ کر ہی سیکولر مسائل یعنی عہد حاضر کے مسائل حل کئے جاسکتے ہیں۔ صرف خود کو اپنے عہدہ سے پیوست رکھنا پڑتا ہے۔

ملا کا المیہ یہ ہے کہ وہ ماضی میں لوٹ کر ہی عہد حاضر کی بات کرتا ہے۔ آج کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ماضی قدیم سے نظیر لانے کی سعی ناکام کرتا ہے اور جو شاعر سیکولر شاعر نہیں ہوتے وہ ادب برائے ادب کے زنداں میں محبوس رہتے ہیں۔ جس طرح ملا مذہب برائے مذہب کے قفس سے باہر لایا جائے تو اپنی پرواز بھلا بیٹھتا ہے۔

شہناز مزمل لائق تقلید اور قابل توصیف ہے کہ وہ اس دنیا میں رہتی ہے اور اس دنیا کی بات بھی کرتی ہے۔

عکس دیوار پہ تصویر ان کا نیا مجموعہ کلام ہے۔ کتاب کے دیباچہ کو "اذن کلام" کا عنوان دیتے ہوئے انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ دیباچہ میں اپنی ماں، اپنے میاں سلطان احمد اور اپنے بچوں مینا، نعمانہ اور فاروق کا ذکر کر دیں اور اپنا مکمل پتہ تحریر کرتے ہوئے اپنا بائیو ڈاٹا بھی لکھ دیا ہے۔ یوں شہناز نے ثابت کیا ہے کہ وہ اس سیکولر دنیا سے باہر کسی خواب و خیال کی وادی میں مقیم نہیں ہیں۔ پھر غوبب ملا کی یاد آتی ہے، جو ہمیشہ ماضی کے خواب و خیال میں ہی کھویا رہتا ہے۔ اور اپنے عہد سے اس قدر لاتعلق ہو جاتا ہے کہ لفظ سیکولرزم کو ہی اپنا دشمن اور حریف جان لیتا ہے۔ کبھی اپنا Biodata پیش کرتا ہے نہ اپنے اہل و عیال کا تعارف کرواتا ہے۔ ملا کا تعارف اس کے فتوے ہیں۔ جس طرح نان سیکولر یعنی ادب برائے ادب والے شاعر کا تعارف اس کے تنفر کرتے ہیں۔ اس کی حیات نہیں اس کا کلام سنا جائے تو واہ واہ کہا جائے۔ اس کی اپنی زندگی کی جھلک دیکھنے کو مل جائے تو اوئے اوئے کہنا پڑے۔

نان سیکولر شاعر کاریگر ہوتے ہیں۔ شعر کے کاریگر، جیسا کہ حضرت جگر مراد آبادی نے فرمایا تھا۔

کاریگران شعر سے پوچھے کوئی جگر
جب وزن پورا ہے تو کمی کیوں اثر میں ہے

الفاظ کو ٹھوک کر پختہ کیلیں لگا کر وزن پورا کر کے شعر گھڑ لینا ایک کاریگری ہے۔ جو کبھی کبھار منفعت بخش صنعت بھی بن سکتی ہے۔ مگر دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ اور شعر سننے والے سامعین پکار اٹھتے ہیں۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

ذاتی وضاحت پیش کرتا چاہوں کہ نان سیکولر شاعر کے بارہ میں جو عرض کر رہا ہوں وہ افسانہ نویسوں اور تنقید نگاروں پر بھی صادق ہے۔

نثر اور شعر میں فرق بیان کرنے سے پہلے عرض کر دوں کہ ادب کیا ہے کہ جو نثر و نظم کا مجموعہ ہے۔ ادب عہد حاضر کا غماض ہے۔ ادب میں عہد حاضر یعنی سیکولرزم نہیں تو وہ خواب خیالی ہے۔ ادبی نثر میں فکر پیدا ہو جائے تو فلسفہ وگرنہ ایک صحافی کی خبر۔ ادبی نظم میں فکر ہو تو شاعری وگرنہ فلمی گانا۔

سیکولر ادب کا تعلق دین و مذہب سے اس لئے ہوتا ہے کہ جس طرح ادب عہد حاضر میں رہ کر مستقبل کی پیش بینی کرتا ہے اس طرح دین و اعتقاد بھی چونکہ مستقبل کی بات کرتے ہیں اس لئے واجب وابستگی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سیکولرزم میں مستقبل قریب سے اور دین میں مستقبل بعید کی بات ہے۔

چنانچہ شہناز مزمل کے مجموعہ کلام "عکس دیوار پہ تصویر" کی تقریب رونمائی میں سیکولرازم اور مذہب کے بابمیں ایک فکر پیش کرتے ہوئے ان کے کلام کا حاصل مطالعہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

شہناز مزمل کو اچھا لگا کہ اپنے دیوان کا آغاز حمد و نعت سے کریں۔

کرم یہ رحمت رب الانام کر دیتا
عطائے جلوہ دارالسلام کر دیتا
ترے لئے کوئی مشکل نہیں مرے مولا
سرور کیف حضوری دوام کر دیتا

نعتیہ شعر میں کہتی ہیں۔

میرے حرف کو جو ملی صدا
میرے جذب نے مجھے دی ندا
ہوئی مستجاب تری دعا
تجھے مل گیا در مصطفیٰ

جب غزل لکھتی ہیں تو اپنی ذات پر اعتماد کا بھرپور اظہار کرتی ہیں۔

نقوش رسم وفا ثبت کر دیئے شہناز — مری صدا یہ یہ سارا جہان بولے گا
میں کھو گئی ہوں مگر اب گمان بولے گا — مکیں بغیر یہ خالی مکان بولے گا
فصیل جسم کی اس قید سے رہا ہو کر — حصار روح میں باقی گیان بولے گا

چھوٹی بحر میں شعر کہتی ہیں تو میر تقی میر کی سہل ممتنع کو یاد دلاتی ہیں

زندگی کا حصار مشکل ہے — موت کا انتظار مشکل ہے

رتجگوں کا شمار مشکل ہے — صبح کا انتظار مشکل ہے

سیکولر شاعر ہوتے ہوئے ملا سے خطاب نہ کرنا ناممکن ہے۔ کہتی ہیں۔

آپ کی امت میں پھر تکرار ہے — کیا یہاں پھر کربلا ہونے کو ہے
اب جنوں کی انتہا ہونے کو ہے — کیا خبر کیا سانحہ ہونے کو ہے

ملا نے خدا کو monoplize کرنا چاہا تو شہناز نے کہا۔

شہناز ہم نے ایسے گزاری ہے زندگی — دنیا میں جیسے کوئی ہمارا خدا نہ تھا

ایسے میں وہ مسیحا کو پکارتی ہیں۔

مجھے بتلا مسیحا ڈھونڈنے تجھ کو کہاں آؤں
وگرنہ یہ ہی بتلا دے سکون دل کہاں پاؤں

جو لطف سکون دل کی طلب میں ہے وہ سکون میں کہاں۔ جب کوئی طلب ہی نہ رہی تو سکون میں کیا لطف۔ شہناز اپنی حسن طلب کو اس طرح بیان کرتی ہیں۔

خواب اکثر ادھورے رہتے ہیں کس کو ملتی ہیں ان کی تعبیریں
اب تو دنیا کے سنگ رہتی ہوں غم زمانے کے ہنس کے سہتی ہوں
جو بھی کہتی ہوں خود سے کہتی ہوں کوئی حسرت نہ کوئی ارماں ہے،

آج کچھ اس طرح سے جیتی ہوں

طلب میں بے ساختگی کا لہجہ اپنانا ہو تو اس دھرتی کی سندر بولی ہندی بولی میں ہی ان کی بات کہی جا سکتی ہے۔ آپ بھی سنئے۔

کوئی مجھے آکر سمجھائے میں نے بھی تھے خواب سجائے
آسوں کے کچھ دیپ جلا کر باقی سارے دیپ بجھائے
پیار کے دو شبدوں کی خاطر رین بسیرے سب ٹھکرائے
رم جھم رم جھم کرتا ساون برہن من میں آگ لگائے
ذہن دریچے بند نہ کرنا شاید پگلی پروا آئے
من اندر گھر کرنے والی مٹھڑی بتیاں کوئی بھلائے
چھوڑ دے اب شہناز [redacted] من اندر بھگون در آئے

خاتون شاعر ہونے کے ناطے سے انداز سپردگی ملاحظہ کیجئے۔

مرے اندر دہکتے ہیں جو انگارے بجھا دو نا بکھرتے خواب آنکھوں میں میری پھر سے سجا دو نا
بہت سے رتجگے آنکھوں میں میری اس نے بوئے ہیں میری کھوئی ہوئی نیندیں مجھے واپس دلا دو نا
بہت بنتی بگڑتی صورتیں ہیں من کے مندر میں میرے اندر جو آذر ہے اسے آکر مٹا دو نا
بنا پتوار کشتی ڈولتی ہے موج دریا پر ہوا کے رخ پہ اس کو اک نیا ساحل دکھا دو نا
میں ہوں کنج قفس میں حسرت پرواز رکھتی میں سو تم مجھ پر بریدہ کو ذرا اڑنا سکھا دو نا

شہناز مزمل کے من میں کوئی جوگی بیٹھا ہے۔ جو اسے آتما کے آورش دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے جو صوفیانہ کلام کہا ہے اس میں تصوف کی بالیدگی نمایاں ہے۔

شہناز مزمل کے نہاں خانہ دل کا مکمل ادراک قاری کو بیک وقت شعر اور فلسفہ کی حقیقت سے آشکار کرتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

روبرو کہہ سکنے کے لئے آج شاعرہ اپنے مداحین و قارئین کے سامنے ہے وہ کچھ ہی کہہ سکیں گی۔ سب کچھ کہہ سکتیں تو شعر کا سہارا نہ لیتیں۔

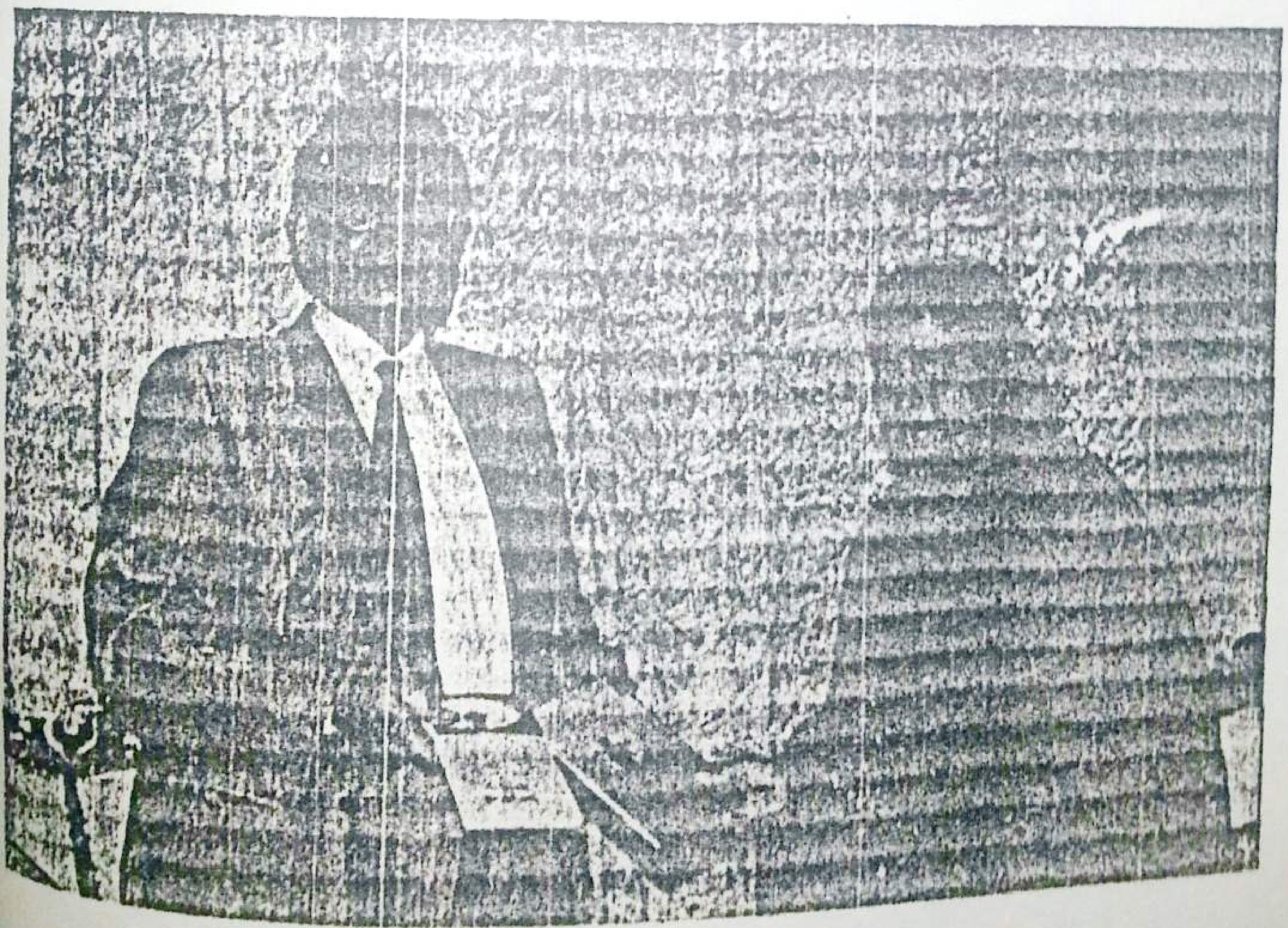
ان کا کلام تو اس قابل ہے کہ پورا سنا جائے اور مکرر سنا جائے۔ تقریب رونمائی میں حرف کلام کا جستہ جستہ تعارف ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔ رونمائی جس کتاب کی ہے وہ کتاب پڑھیے اور شاعر کے ہم سفر بن جایئے۔ عہد حاضر کے مسائل ایک طویل اور باہمی سفر کے متقاضی ہیں۔

گردش فلک چین نہ لینے دے گی، اس لئے
غنیمت ہے جو ہم سیرت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

یہ مصرع تو حضرت انشاء کا ہے۔ شہناز مزمل کے الفاظ میں مکرر عرض ہے۔

وقت کا کرب اکیلے ہی سہا ہے میں نے
ہم سخن بن کے میرا درد ذرا کم کر دے

حسن معزالدین قاضی نے یہ مضمون ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر صدارت
"عکس دیوار پہ تصویر" کی تقریب رونمائی میں پڑھا



# موم کے سائباں ------- ایک تاثر

تحریر = شاہد حنائی، کراچی

شہناز مزمل کا نام ادبی و شعری حلقوں میں منفرد شناخت رکھتا ہے۔ آپ کی شعر و نثر کی کئی کتابیں اردو ادب میں اضافہ کر چکی ہیں۔ اقبالیات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ ایک سے زیادہ زبانوں پر انہیں عبور حاصل ہے۔ تراجم نگاری میں مستقبل میں معتبر قرار پائیں گی۔ معیاری شاعری کی پرکھ رکھنے والے قدر دانوں نے پیام نو' جذب و حروف' جرات اظہار اور عکس دیوار پہ تصویر کی اشاعتوں پر شہناز مزمل کو تحسین و ستائش بھرے کلمات سے نوازا ہے۔ انہی شہناز مزمل کا "موم کے سائباں" نیا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ "موم کے سائباں" کی غزلیں شہناز مزمل کی شاعری کا اہم سنگ میل ثابت ہوں گی۔

شاعری نازک جذبوں کی ترجمان ہوتی ہے۔ شعر گوئی میں لہجہ بنیاد ہوتا ہے۔ تلخ و کرخت لہجے میں مدعا بیان کرنے والوں کو مات ہوئی ہے۔ میر و غالب نے کیا کیا مضمون باندھے ہیں مگر نرم و لطیف آہنگ ہر جا ساتھ رہا ہے۔ یہی حسن شہناز مزمل کی شاعری کا خاصہ ہے۔ آپ پچھلے دس برسوں سے اشعار تخلیق کر رہی ہیں۔ اس ریاضت نے ان کی شاعری کو نکھارا ہے۔ فنی طور پر جو تجربہ شہناز مزمل کو حاصل ہوا ہے وہ ان کے کلام کی بنت سے ظاہر ہے مگر میں زیادہ اہم خوبی وہ احساسات جانتا ہوں جو اک خاص عمر کا مقدر ہوتے ہیں۔ مگر شہناز مزمل کے ہاں اب بھی وہی فضا موجود ہے۔ جو دس برس قبل ظاہر ہوئی تھی۔

"موم کے سائباں" میں خواب' سرگوشیاں' دھڑکیں' شعر' شعر موجود ہیں۔ لڑکیاں جو کچھ دیکھتی' سوچتی اور چاہتی ہیں۔ شہناز مزمل کی شاعری انہی سپنوں جیسی باتوں کا اظہار ہے۔ مجھے اشعار کی غالب تعداد ملی ہے جو خواب نگر کی فضا رکھتے ہیں۔ اس نگری میں خلوص' سچائی' ایثار کی فراوانی ہے۔ محبوب پر اعتماد ہے اور طلب کو یہی وسیلہ بنتا ہے۔ طلب سے مراد کوئی دنیاوی مادی اشیاء نہیں بلکہ جذبات' احساسات' اور روح کی ضرورتیں اور تقاضے ہیں۔ اگر قرات کرنے والی نگاہ حسن مطالعہ سے آشنا ہے تو یہ شعر گنگناتی نظریں پڑھیں گی۔

میرے لئے لکھے ہیں اگر رتجگے تو نے
کچھ خواب میری جاگتی آنکھوں کو عطا کر

سجدے کے نشانوں سے جبیں زخم ہوئی ہے
اور تجھ سے مقدر میرا بدلا نہیں جاتا

محبت انتہا ہو کر حسن کا روپ دھارتی ہے۔ عشق میں مغلوب ہونے، محبوب کے زبردست رہنے کی خواہش تڑپاتی ہے۔ سارے اختیار محبوب کو سونپ کر بے اختیاری میں سرمست رہنا ہی عشق کا حاصل ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام کی سرائیکی شاعری میں یہ رنگ بہت گہرا ہے۔ شہناز مزمل کی شاعری بھی دراصل محبت کی شاعری ہے۔ وہ اپنے سارے حوصلے محبوب کی دین جانتی ہیں اور ہر شکست کو نشانی کے طور عزیز رکھتی ہیں۔ "موم کے سائبان" میں محبوب اور محبت پر بھرپور اعتماد کا اظہار ہے۔ اگر شکوے شکایتیں ہیں تو بھی اپنائیت نمایاں ہے۔ محبت کے رنگ میں رنگی یہ شاعری زیادہ بھلی اس لئے بھی لگتی ہے کہ اس میں چاند ستاروں، پھولوں، پتوں، ہواؤں، بادلوں کو رابطہ بنانے کی بجائے براہ راست انسان کو خطاب کیا گیا ہے۔ دوسری خوبی خود سپردگی کی بجائے ہمسفری کی خواہش ہے۔ ان دونوں پہلوؤں نے شہناز مزمل کی شاعری کو ان شاعرات سے زیادہ معتبر اور اہم ثابت کیا ہے جو موجودہ صدی کی پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں طوفان بن کر آئیں اور ہواؤں کے رخ بدلنے پر جھاگ بن کر رہ گئیں۔ ذیل کے تین شعر دیکھئے کیا وقت کی گردش انہیں فراموش کر سکے گی؟

یہ تیرے ساتھ لفظوں نے بھی کیوں چپ سادھ لی جاناں
ادھر آ لفظ کی دہلیز سے مل کر گزر جائیں

میں تھک گئی ہوں قدم میرے اب نہیں اٹھتے
میری طویل مسافت کو مختصر کر دے

میں خواب سے آگے کا سفر کیسے کروں گی
مت چھوڑ اکیلا مجھے یوں خواب دکھا کر

شہناز مزمل محسوسات کی شاعرہ ہیں۔ آپ اپنائیت و چاہت کی کیفیات کو لفظوں کی زبان عطا کرتی ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سب دیکھتے ہیں۔ اکثر سمجھتے ہیں۔ کہتے بہت کم ہیں اور کہنے میں کامیاب تو خال خال ہی ہوتے ہیں۔ یہی باتیں شہناز مزمل نے کمال فن کے ساتھ کہی ہیں۔ جو خیال صرف سوچوں میں پروان چڑھتے ہیں وہ بیان و تحریر میں کم ہی ڈھلتے ہیں۔ یہی خیال یہی سوچیں شہناز مزمل کہہ گزری ہیں۔ زیادہ خوشی یوں ہے کہ ان کو شعری قالب میں نہایت سلیقے اور مہارت سے منتقل کیا گیا ہے۔ صرف دو شعر پیش کرنا چاہوں گا۔

کون جانے وہ حسیں تھا کہ تمنا میری
ڈھونڈ لائی تھی کہیں سے میری رسوائی کو

میرے دل سے دعا نکلتی ہے
جانتی ہوں کہ وہ ستم گر ہے

میں جزیرے میں نیند کے اتروں
خواب آنکھوں میں اب بسا بھی دے

سبز رت میں گلاب جھلسے ہیں
بیتے موسم کا زخم گہرا ہے

اردو میں بیشتر شاعرات نے الھڑپن اور ٹوٹ کر چاہنے کے اظہار کو شعر کہا ہے۔ مختلف ادوار میں کئی کامیاب نام ابھرے۔ مگر اک خاص دورانئے کے بعد ان کے لہجے سے وہ دوشیزگی جاتی رہی جس نے انہیں نام و مقام عطا کیا تھا۔ ان کی شاعری میں زمانہ شناسی کی جھلک آگئی۔ چند سینئر شاعرات تو مردانہ لہجے میں کلام پیش کرنے لگیں۔ میں اپنی بات پھر دہراتا ہوں کہ برسوں کی مسافت نے شہناز مزمل سے ان کے کلام کی تازگی نہیں چھینی۔ وہ آج بھی گنگناتے شعر تخلیق کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں شہناز مزمل کے اندر کے موسم وقت سے زنگ آلود نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بے معنی علامتوں، استعاروں کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ محسوسات، مشاہدے اور شعری صلاحیتوں کے خزانے سے انہوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جو براہ راست جذبوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ تجربے کی بھٹی ان کے حسن میں اضافے کی بجائے بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ شاید شہناز مزمل شاعری کرتے سے اپنی ادبی حیثیت کو فراموش کر دیتی ہیں۔ ہاں یقیناً ایسا ہی ہوگا ورنہ ایسے شعر نامور نہیں نو آموز شاعرہ سے توقع کیے جاتے ہیں۔

ذرا سی دیر مجھے بھی سکوں ملے شاید

یوں تو شہناز مزمل کی مکمل شاعری کا لہجہ دلکش ہے مگر وہ خاص طور سے بعض مقامات پر فضا کی تشکیل کرنے پر قادر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت لفظ اپنے ظاہری استعمال سے بڑھ کر مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ہر لفظ ایک سے زیادہ مفہوم رکھتا ہے۔ شعروں کے مصرعوں میں برتے گئے لفظ اک نئی اہمیت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شہناز مزمل کے شعروں میں قاری شاعری کے تخیل کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ قاری کہیں خود کو اجنبی تصور نہیں کرتا۔ ''موم کے سائبان'' میں ایسے اشعار کی خاصی تعداد ہے جو پہلی نظر میں متاثر کرتے ہیں۔ پھر انہی اشعار کی پرتیں انکشاف ہوتی ہیں تو یہ تاثر مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ شعر شناس آنکھیں ہی ان شعروں کی قدر کر سکتی ہیں۔

وہ مجھ سے میرا پرانا حساب لے جائے
بھلا کے ترک تعلق وہ آئے اور شہناز
محبتوں کا ہر اک انتساب لے جائے

عجیب الجھن میں مبتلا ہوں
نہ جیت مانگوں نہ ہار چاہوں

بدلتی رت میں پریشاں کرے جو سناٹا
فضا میں کوئی پرندہ اڑا دیا کرنا
گماں یہ گزرے کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا
ہوا کے ہاتھ پہ پیغام لکھ دیا کرنا

شہناز مزمل نے اپنی شاعری میں جو فضا بنائی تھی۔ اسے انھوں نے تاحال کمال حسن کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ وقت کی مسافت نے ان کے کلام میں فنی طور پر پختگی تو پیدا کی ہے مگر جو تازگی ابتدا میں ان کی شناخت بنتی تھی وہ ہنوز نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ مثلاً یہ شعر مطالعہ کریں جہاں امید' حوصلے' حسرتیں سب موجود ہیں مگر شعریت کے سانچے میں۔

وشت نامعلوم سے معلوم کی جانب سفر
تھا کٹھن پر ہم خیال یار میں بڑھتے رہے

محبتوں کے سمندر کی پیاس کیا بجھتی
نصیب قربت جاناں تو اس برس میں نہیں

تعبیر کے ارمان میں بنتی ہوں نئے خواب
اب خواب بکھرنے پہ کوئی غم نہیں ہوتا

شہناز مزمل کا نام ہمارے ادبی حلقوں میں خاصا معروف ہے۔ ادبی جرائد میں ان کی تخلیقات تواتر سے چھپتی رہی ہیں۔ شعری نشستوں اور مشاعروں میں ان کا کلام سنا جا رہا ہے۔ آپ غزل اور نظم پر عبور رکھتی ہیں۔ نظم ہو یا غزل ناقدین اور مبصرین نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ "موم کے سائباں" میں شہناز مزمل کی خوبصورت غزلیں اور نظمیں موجود ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ "موم کے سائباں" شہناز مزمل کی شناخت میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گا۔ خواہش ہے کہ ان کا شعری سفر اسی لگن اور حوصلے کے ساتھ جاری رہے۔ یقین ہے کہ مستقبل قریب ان کے کلام کو کہیں زیادہ توانا' دلکش آواز میں دیکھے گا۔ مستقبل بعید کا فیصلہ ان کے حق میں ہو کر رہے گا کہ اس وقت گروپ' تعلقات' وسائل سمیت کوئی سیڑھی مددگار ثابت ہو گی۔ کیونکہ تیز دھوپ میں برف کو پگھلنا ہی پڑتا ہے اور صرف سخت ستون ہی باقی بچ رہتے ہیں۔

# شہناز کا انداز

## شبیر قادری

ذاتی طور پر میں شعروادب کو مردوں اور عورتوں کے الگ الگ ڈبوں میں بند کرنے کا قائل تو نہیں اس لئے کہ ادب بس ادب ہوتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مگر شہناز کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنے اس موقف میں تھوڑی سے لچک پیدا کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لئے کہ شہناز کا انداز شعر گوئی اور لب ولہجہ نسوانی لب ولہجہ ہے۔ شہناز مزمل کے ہاں مجھے زبان وبیان کی وہ نرمی، ملائمت اور کوملتا ملتی ہے جو عورت سے مخصوص ہے۔ اور اس کی شناخت اور پہچان بھی۔ جذب و حرف کے مطالعہ کے دوران میں بھی شہناز مزمل کے اسی رنگ و آہنگ نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کروائی تھی اور عکس دیوار پہ تصویر میں بھی وہ رنگ زیادہ گہرا ہوکر مجھے متاثر کر رہا ہے۔

میرے اندر دہکتے ہیں جو انگارے بجھا دو نا
بکھرتے خواب آنکھوں میں مری پھر سے سجا دو نا
میں ہوں کنج قفس میں، حسرت پرواز رکھتی ہوں
سو تم مجھ پر بریدہ کو ذرا اڑنا سکھا دو نا

"لوح وجود" نامی نظم میں بھی وہ تلاش و جستجو میں ہے کہ

کوئی تو ہو جو مرے ساتھ چل سکے دو پل
کوئی تو ہو جو مرے دل کی بات کو جانے
کوئی تو ہو جو مرے ہی وجود جیسا ہو
کوئی تو ہو جو مری ذات میرا حصہ ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کی بھٹی کو
وفا کی دھیمی پھواروں سے ماند کر ڈالے
کوئی تو ہو جو مرا صرف میرا اپنا ہو

شہناز کی شاعری کو میں عورت کی شاعری اس لئے نہیں کہتا کہ اس میں آزادی نسواں کا پروپیگنڈہ ملتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے قلم سے نکلنے والے نرم و گداز لفظ اسے نسائی سوچ کا حامل بناتے ہیں۔ شہناز مزمل کا قلم نہ تو فہمیدہ ریاض کی طرح بے باک قلم ہے نہ پروین شاکر کی طرح ٹین ایجر کے رومان کے چنچل رنگوں میں رنگا ہوا اور نہ کشور ناہید کی طرح حقوق نسواں کے نعروں کے انگارے چھوڑتا ہوا بلکہ اس کے قلم میں مجھے ادا جعفری کا سا تقدس نظر آیا ہے۔ اس ایک قلم میں مجاز اور حقیقت دونوں جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔

فسوں زدہ ہوں تمناؤں کے حصار میں ہوں
دبیز کہر شبستاں ہے میں غبار میں ہوں
نوشتہ جو بھی ہو خاموش لب رہے ہیں مرے
ہے فیصلہ یہ انی کا میں کس شمار میں ہوں

شہناز مزمل کے ہاں حیرت و استعجاب کا ایک جہاں آباد ہے۔ لڑی در لڑی جسے اس نے اپنی شعروں میں پرویا ہے۔ شہناز کی یہ حیرت ایک معصوم بچے کی سی حیرت ہے جو کسی نئی چیز کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور اس کے بارے میں جاننے کیلئے متجسس اور بے چین بھی۔ شہناز کے ہاں ایک انجانی دنیا کو دیکھنے اور جاننے کی خواہش تمنا اور جستجو ملتی ہے اور جب اس بارے میں افکار و خیالات اس پر یورش کرتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتی ہے کہ

میری سوچوں پہ پہرے ہیں زبان میری بھی اب چپ ہے
میں اس افکار کی یورش کو لے کر اب کہاں جاؤں
میرے اندر دہکتے ہیں الاؤ کیسے بتلاؤں
نہاں ہیں داغ سینے میں کسی کو کیسے دکھلاؤں
میری آنکھوں سے نیندیں چھین لی ہیں کرب پیہم نے
بتا زخموں کا مرہم ڈھونڈنے میں کس جگہ جاؤں
میری راہوں کے سارے نقش مدھم ہو گئے ہیں اب
مرے ساتھی بھی تھک کر راستے میں سو گئے ہیں
مجھے بتلا مسیحا ڈھونڈنے تجھ کو کہاں آؤں
وگرنہ یہ ہی بتلا دے سکون دل کہاں پاؤں

یہ اور اس قسم کی مستفسرانہ شاعری پڑھتے ہوئے قاری خود بھی سراپا استفسار بن جاتا ہے۔ آئینہ سا ہو جاتا ہے۔ خود "عکس دیوار پہ تصویر" کے فلیپ نگار فیصل حنیف کو اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا وہ لکھتے ہیں کہ۔

"شہناز مزمل کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ جیسے میں دشت حیرت میں سفر کر رہا ہوں۔ اور اس کے ہر قدم پر اک نئی حقیقت میری منتظر ہے یا پھر یوں ہے کہ پرانی حقیقتیں اپنے چہرے اور پیرہن بدل بدل کر میرے سامنے آ رہی ہیں"۔

"عکس دیوار پہ تصویر" کی شاعرہ خود کو اس بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرتی ہے۔ اکلاپے کا یہ دکھ اسے شعر در شعر مضطرب اور بے چین رکھتا ہے وہ اپنے ذات میں تنہا ضرور ہے مگر اس کا پھیلاؤ بھی چاہتی ہے اس لئے وہ کسی سہارے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ کوئی ہے جسے وہ ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے یا جس کے ساتھ خود چلنا چاہتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں اس کے اندر کا کرب 'اکلاپا' تنہائی اسے کسی دوجے کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ کوئی دوجا مجازی صفات کا حامل ہو سکتا ہے اور وسیع تر معنوں میں اس کا ناتا حقیقت سے بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ وہ حقیقت جس کی موجودگی میں شہناز مزمل بقول منصور آفاق باطنی تبدیلی کی خواہش مند شاعرہ قرار پاتی ہے۔ وہ زمین کی پستیوں سے تنگ آ چکی ہے اس لئے اپنے رابطے لولاک کی وسعتوں سے رکھنا چاہتی ہے جبھی تو وہ کہتی ہے کہ

تیرے ہمراہ چلنا چاہتی ہوں سہارا دے، سنبھلنا چاہتی ہوں
اٹھا دے غیب سے پردہ کوئی تو حوادث میں سنبھلنا چاہتی ہوں
بھلا کر وعدہ فردا کو اب میں نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہوں

اور جب اسے کوئی اشارہ ملتا ہے۔ امید یقیں کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو پھر اس کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ

آج اپنی دعاؤں میں اثر دیکھ رہی ہوں میں شام مقدر پہ سحر دیکھ رہی ہوں
ہاتھوں میں لئے آج میں کشکول گدائی یزداں تیرا فیضان نظر دیکھ رہی ہوں

فیصل حنیف شاعری کو نامعلوم کا سفر قرار دیتے ہیں لیکن حقیقی اور سچی شاعری کا ایک پہلو معلوم سے نامعلوم کی جانب سفر ہے تو دوسرا نامعلوم سے معلوم کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ شہناز مزمل کے ہاں یہ دوسرا رویہ بھی ملتا ہے۔ جہاں جہاں وہ نامعلوم سے معلوم کی طرف آئی ہے، اور معلوم کے مضراب سے نامعلوم کے تاروں کو بھی چھوا ہے۔ اور اس کے یہ جوہر اس کی غزل سے زیادہ نظموں میں کھلتے ہیں جہاں وہ غزل کے بند ڈبوں سے نکل کر نظم کی آزاد فضاؤں میں طائر خیال کو کھلا چھوڑ دیتی ہے اس کی مختصر نظموں میں ایک شاعرانہ سی فصاحت ملتی ہے۔ جس سے اس کی تفہیم و تعبیر میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ "من کی انکھیاں" اس کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

بن میں کوکو کرتی کوئل

پی کو پاس بلائے
داتا دونکا چگنے والا
پیٹ بھرے اڑ جائے
درشن کی پیاسی جوگنیا
نگر نگر منڈلائے
دان کرے درشن جل کوئی
نہ من پیاس بجھائے
من اندر ہے پی کی مورت
بیاکل دیکھ نہ پائے
من کی اکھیاں روشن کرلے
پی کے درشن پائے

جمال احسانی کا ایک شعر ہے۔

گھر بھی عزیز' شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں عمر بھر کا ہے

(رات کے جاگے ہوئے صفحہ ۱۵۱)

شہناز مزمل نے شوق سفر کا جو روگ پالا ہے لگتا ہے کہ وہ جنم جنم سے اس کے ساتھ تھا اور ابد ابد تک رہے گا۔ شہناز کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔ یہ سفر ایسا سفر ہے جس میں دو چار مشکل مقام بھی آتے ہیں۔ مگر شہناز جس اعتماد اور خلوص کے ساتھ یہ سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بعید نہیں کہ وہ اس منزل تک جلد پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائے۔ جو اس کے ذہن و قلب نے پہلے سے متعین کر رکھی ہے۔

کہو زمان و مکاں سے کہ میرے ساتھ چلیں
ہے تیز رخش سفر میں ۔۔۔ رکاب میں ہوں
گئی ہے گردش دوراں کی منتظر شہناز
صلیب وقت کے تازہ تریں نصاب میں ہوں

# حروف جذبات

## مسز کنیز اسحاق

شاعر یا ادیب ہونا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ شاعری نسبتاً مشکل کام ہے۔ اظہار رائے اور منظر آرائی اور پھر جذبات کا مدوجذر کم سے کم الفاظ میں کسی شاعر ہی کا خاصہ ہے۔

شاعری ایک قدیم روش ہے جو سالہا سال سے چلی آرہی ہے۔ اس کا زیادہ تر رجحان مردوں میں پایا جاتا رہا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر شاعری کا جذبہ عورتوں میں بھی پروان چڑھتا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سی پرانی اور نئی شاعرہ خواتین معاشرے کے دکھوں' ان کہی کہانیاں' جذبات کے پیچ وخم اور اپنے اندر کے خوابیدہ احساسات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے میں مصروف عمل ہیں۔

ڈاکٹر شہناز مزمل کا شمار بھی ایسی ہی شاعرہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ جس نے اپنے جذبات حروف کی زنجیر میں پرو کر ان کا برملا اظہار کیا ہے۔ محترمہ شہناز مزمل نے عورت کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ وہ صرف خاتون خانہ بھی نہیں بلکہ ایک وسیع و عریض دنیا کی ایسی ایسی ہستی ہے جس کا اپنا ایک مقام ہی ایک وجود ہے جس کی کوئی واضح پہچان ہے۔ وہ عورت کی وفا ایثار اور جذبوں کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ عورت کو اس کی ذات کے اندر کی عورت کے کردار کو مضبوط بنانے کی بھی تلقین کرتی ہیں۔ عزم صمیم کی علمبردار یہ خاتون خود زبان حال سے یہ کہتی نظر آتی ہے کہ

شہناز نے بھی سیکھا نہیں ہار ماننا
اب فیصلہ بھی اپنا سنا دیجئے مجھے

عکس دیوار پہ تصویر میں انہوں نے مذہب سے واضح طور پر عقیدت فرمائی ہے اور در مصطفیؐ کی حاضری کی خواہش اور عشق رسول کی وجہ سے شہناز صاحبہ کی شاعری میں اقبال کا سا رنگ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ انقلابی قسم کی شاعرہ ہیں۔ جن کے کلام کو ہم عاشقانہ کلام تو نہیں کہہ سکتے۔ تاہم ان کے کلام میں جذب نفس کا بہت زیادہ دخل ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ ہی عشقیہ جذبات کا بھرپور اظہار۔ پھر بھی ڈاکٹر شہناز نے زندگی کی تمام گہرائیوں کو انتہائی فہم اور آسان زبان میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک عام سطح کا انسان بھی سوچتا ہے کہ شاید جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اسی کے لئے ہے۔

ان کی شاعری میں ایک کوشش پیہم ہے جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے۔

کیا ہے منجمد افکار جاں نے
میں پتھر ہوں پگھلنا چاہتی ہوں
صلیب وقت کندھوں پر اٹھا کر
میں تھوڑا تیز چلنا چاہتی ہوں

ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری ان کے اندر کے جذبات کا ایک الاؤ ہے جو کہ ان کے نزدیک ایک کڑے وقت کی آزمائش کی صورت میں ان کے سامنے آتا ہے۔ محترمہ نے اپنی انا اور کرب کو جن الفاظ کا جامہ پہنایا ہے وہ صرف اور صرف انہی کا خاصہ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

میں بھی انسان ہوں سینے میں دھڑکتا دل ہے
اپنے ارمانوں کو سینے میں چھپا کر اب تک
اپنے جذبات کو ہر اک سے چھپایا اب تک
چاہتیں بانٹی ہیں دنیا کو محبت دی ہے
خود ٹھٹھرتی رہی دنیا کو حرارت دی ہے
آج کچھ کرب میرا آؤ ذرا بانٹ ہی لو
اس سے پہلے کہ چھناکے سے میرا دل ٹوٹے
کرچیاں اس کی بکھر جائیں تیرے پاؤں تلے

ڈاکٹر شہناز مزمل کے جذبات میں ایک سمندر نظر آتا ہے۔ شاعری کے لامحدود اور وسیع امکانات موجود ہیں اور ان لامحدود امکانات کو نہ صرف وہ حقیقی روپ دینا چاہتی ہیں بلکہ کسی نہ کسی حوالے سے ذکر کر کے محبت کی مثال دے دیتی ہیں۔ کسی شاعر نے کہا۔

تاج محل تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی

دوسرے نے کہا۔

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل
ساری دنیا کو محبت کی نشانی دی ہے

اور پھر ساحر نے کہہ دیا۔

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

مگر ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ نے تاج محل کو بالکل ایک انوکھے اور اچھوتے خیال کے ساتھ اپنے دل کی دنیا میں تعمیر کرنے کا مشورہ دے کر کہا۔

بدب د ں ں ہے ے ں ری ہے

عشق و ہستی کی فنا تو نے کبھی دیکھی ہے
فلسفہ جذب و فنا کا جو سمجھ جائے تو
پھر تو بن جاتے ہیں کتنے ہی حسین تاج محل

ان تمام باتوں سے ہٹ کر ایک وضاحت میں ضروری سمجھتی ہوں۔ ہر مسافر کی ایک منزل ہوتی ہے جس تک پہنچنے کے لئے اسے راستے کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک راہوں کا تعلق ہے کچھ راستے پہلے سے متعین ہوتے ہیں۔ جن پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن مسافر مشکل پسند ہوتے ہیں۔ شہناز مزمل صاحبہ بھی ایک ایسی ہی مسافر ہیں جنہوں نے اول تو راہوں کو انتخاب ہی الگ تھلگ طریقے سے کیا ہے۔ دوسرے وہ منزل تک پہنچنے کی کچھ زیادہ متمنی نظر نہیں آتیں۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو رواں دواں رکھنا چاہتی ہیں اور منزل تک پہنچنے کے بعد جو قدرے جمود اور سکوت آجاتا ہے وہ اس کی قائل نہیں ہیں بلکہ ایک انقلابی شاعرہ ہونے کی وجہ سے وہ متحرک زندگی کی قائل نظر آتی ہیں جن کے لئے اگر میں یہ کہوں کہ۔

منزلیں ذوق تجسس کو سلا دیتی ہیں
ہم تو راہوں کے طلب گار ہیں منزل کے نہیں
ڈوب کر بحر حوادث میں نکھرتی ہے حیات
ہم تو طوفان کے طلب گار ہیں ساحل کے نہیں



جنوں کے دور میں خود سے بھی رابطہ کب تھا
کبھی زمانے سے کچھ بھی کہا سنا کب تھا

میں گرد راہ کو منزل کا راستہ سمجھی
مری نگاہ کا دھوکا تھا قافلہ کب تھا

# کلام شہناز کا نفسیاتی جائزہ

صادقہ نصیر

شہناز مزمل کی شخصیت پر ذاتی اور ظاہری حوالوں سے روشنی ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ شہناز مزمل کی شاعری کا حوالہ ہی بہت بڑا حوالہ ہے۔

شہناز مزمل وہی ہیں جو شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک عورت اور ایک بہت اچھی عورت جو دوسری عورتوں کے لئے پاکیزگی اور تقدس کا پیغام دیتی ہیں۔

عورت ہر روپ میں جلتی ہے، پگھلتی ہے، کٹتی ہے اور جلد ہی مر جاتی ہے۔ اسے اس کے اندر کا کرب مٹا ڈالتا ہے۔ یہ موت دراصل اس کی شناخت کی علامت ہوتی ہے۔ لیکن شہناز مزمل نے اپنے لئے Survival کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے اور وہ ہے شاعری کا راستہ۔

شہناز مزمل ایک عورت ہیں۔ موم کی خاصیت رکھنے والی اور پگھلنے والی۔ پگھلنا عورت کا مقدر ہے لیکن شہناز کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اسی موم سے سائبان بنانے کا فن خوب جانتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس سائبان تلے رہنا بھی خوب جانتی ہیں۔

شہناز اپنی سائیکی کی تمام تر دفاعی میکانزموں سے لڑنا جانتی ہیں۔ اس طرح کہ وہ تاویل اور ارتقائی اور تصعیدی طریقوں سے روشناس ہیں جو اور مطابقت پذیری کے لئے ضروری ہیں اور عورت میں مطابقت پذیری کی صلاحیت اس کے درجات بلند کرتی ہے۔ لیکن شہناز نے اسی مطابقت پذیری کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ گویا انہوں نے امر ہونے کے سامان کر رکھے ہیں ...... کسی عورت کے لئے یہ سب کچھ بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر مشرقی عورت کے لئے کہ نہ تو وہ زبان سے لڑ سکتی ہے نہ تلوار سے اور نہ قلم سے اور نہ ہی چھپ کر۔ یہ ایک بہت بڑا مجاہدہ ہے۔ شہناز نے یہ جہاد کرتے ہوئے عقل و دانش کا سہارا لیا ہے۔ شہناز کا فلسفیانہ انداز فکر اور عقل و دانش اور جہاد کرنے کی حوصلہ مندی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ یقیناً یہ ان کی شخصیت کی Projection ہے۔

شہناز کی شاعری کو خاص طور پر موم کے سائبان کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کتاب دراصل Introspection کا ایک خوبصورت نغمہ نمونہ ہے۔ شہناز نے اپنے Introspection کے ذریعہ کچھ اس طرح سے اپنی ذات کے دکھ، کرب، خوف، احساسات، خواہشات اور تمنائیں محرکات اور تجسس وغیرہ کی عکاسی کی ہے کہ یہ تمام داخلی کیفیات قاری کو اپنی کیفیات معلوم ہوتی ہیں۔ گویا شہناز لوگوں کے دلوں میں اترنے کی کوشش میں کامیاب ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس کتاب میں ذات کا دکھ ایک ذات کا دکھ نہیں بلکہ اجتماعی سائیکی کا دکھ ہے۔ اور جب کوئی شاعر کسی اجتماعی مسئلہ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی تو شاعر کا کلام افادی پہلو کا حامل ہو جاتا ہے۔

شہناز کی شاعری اور اس کتاب پر گزشتہ دنوں ایک مضمون سننے کو ملا جس میں اس بات کا ذکر تھا کہ شہناز کی شاعری محبت کی یا رومانوی شاعری ہے۔ موم کے سائبان کو پڑھنے کا اشتیاق ہوا کہ اگر ایسا ہے تو یہ شہناز کے Image کو حقیقی رنگ میں اجاگر نہیں کرتی۔ موم کے سائبان میں اول تو کہیں بھی شہناز کی شخصیت کا رخ نظر نہیں آیا۔ ہاں اگر ایسا ہے بھی تو محبت کا مفہوم وہاں عامیانہ اور عاشقانہ انداز لئے ہوئے نہیں ہے۔ دراصل محبت کو بھی ہر شخص اپنے Perspective کے حوالے سے دیکھتا ہے اس میں وسعت نظر اور وسعت ذہن کا دخل بہت ہے۔ محبت کو محض رومانویت کے معنی نہیں پہنائے جا سکتے کیونکہ اس کے علاوہ بھی محبت بہت سے مقدس روپ میں ظاہر ہوتی ہے یا اس [illegible] ہو سکتا ہے۔ شہناز کی شاعری کے بارے میں یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ گمراہ کن عاشقی کی شاعری نہیں (جو کہ عام طور پر غزل کا مزاج ہوتی ہے) شہناز نے بڑے مجاہدے کے ساتھ غزل اور نظم کو نیا عنوان اور رنگ دیا ہے۔ البتہ شہناز کے کلام میں نامعلوم منزلوں، روشنی اور سکون کی تلاش ہے۔ جہاں احساسات اور خواہشات کی بھرمار ہے وہاں خوف کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ پرواز کی خواہش ہے کہ وہ اس خواہش میں لامکاں کی رفعتوں تک نظر آتی ہیں۔ منزل اور روشنی کی تلاش اور منزل کے بعد حیرانی بھی۔ تنہائی کا کرب اور پھر اسی کرب اور خوف سے نکل کر کھڑے ہونے کا سلیقہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں حوصلے اور جذبے کا پیغام بھی ہے۔

اقبال کی طرح پیغام اور محرک پرواز بھی ہے۔

میرا شوق تھا میرا ہم سفر، تھی بلندیوں پر مری نظر
نہ زمین کی قید میں رہ سکی ہر اک آسمان سے گزر گئی

ظلمتوں کو مٹانے کا پیغام اور شوق بھی کہ

سورج کے نکلنے کی خبر مجھ کو بھی کرنا
ظلمت کدہ شب میں تو ٹھہرا نہیں جاتا

شہناز کی شاعری میں تصوف اور روحانیت کا رنگ بھی ہے جو کسی عورت کی شاعری میں حیران کرنے کے لئے کافی ہے لیکن شہناز کی شخصیت کی عاجزی بھروسہ اور پاکیزگی اس کی دلیل ہے۔ دراصل شہناز کی شخصیت کے اس پہلو کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ محبت کا مفہوم حقیقی محبت ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ان اشعار میں ملتا ہے کہ جہاں وہ زہد و عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور اپنے اشعار میں سجدوں کا ذکر کرتی ہیں۔ لیکن سجدوں میں بھی ایک عجب تمکنت کا انداز ہے کہ اقبال کی طرح وہ بڑے اعتماد سے شکوہ کرتی ہیں۔

سجدے کے نشانوں سے جبیں زخم ہوئی ہے
اور تجھ سے مقدر میرا بدلا نہیں جاتا

چشم تر میری پتھرا گئی تو کیا ہو گا
یقین کی آخری حد آ گئی تو کیا ہو گا

انا اور خودی کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ہم اپنی اناؤں کا بھرم رکھتے ہیں شہناز
ہر بات پہ طوفان اٹھایا نہیں جاتا

شہناز کی شاعری میں خود کلامی کی گونج بھی ہے اور جاناں کا لفظ اسی خود کلامی کی علامت کے طور پر کہا گیا ہے جس کو دوسرے معنی ہرگز نہیں دیئے جا سکتے۔ شہناز کی خوبصورت غزل کے چند اشعار ضرور سنانا چاہوں گی۔

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کمان سے گزر گئی
رہے فاصلے میرے منتظر میں تو جسم و جان سے گزر گئی
مجھے راستوں کی خبر نہ تھی اڑی خاک میرے وجود کی
میں تلاش کرتی ہوئی تجھے تیرے لامکان سے گزر گئی
تھیں طویل اتنی مسافتیں کوئی ساتھ میرا نہ دے سکا
وہ یقین کی حد پہ ٹھہر گیا میں ہر ایک گماں سے گزر گئی
وہ سیاہ شب تھی فراق کی کئی دیپ آنکھوں میں جل بجھے
مجھے جگنوؤں نے نوید دی کہ تو امتحان سے گزر گئی

خدا کرے کہ شہناز مزمل خود اعتمادی، حوصلہ، تجسس اور تلاش عرفان کا پیغام اپنی کتابوں اور کلام کی صورت میں پہنچاتی رہیں۔

# روزنامہ امروز

## انٹرویو = فرزانہ ممتاز

شہناز مزمل سے میری ملاقات خواتین کی تقریبات میں اکثر ہوتی رہتی ہے لیکن مجھے ان سرسری نوعیت کی ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کے خوبصورت تخلیقی اور تعمیری پہلوؤں کو جاننے اور جانچنے کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ صلاحیتوں کے حسن اور جذبوں کے زیور سے مالامال یہ خاتون ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں کہ اس وقت جبکہ میں ان سے اور ان کے دلکش کردار سے مکمل آگاہی حاصل کر چکی ہوں تو مجھے یہ سوچ کر کچھ افسوس سا ہوتا ہے کہ کاش! میں شہناز مزمل کے متعلق بہت جان چکی ہوتی۔ شاید میرا یہ تاسف اس لئے بھی ہے کہ میں اکثر قارئین سے ایسی خواتین کو اپنے قلم کے ذریعہ متعارف کرواتی رہتی ہوں جو ہر پہلو اور ہر اعتبار سے مکمل خواتین کہلوانے کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ شہناز مزمل بھی ایک ایسی ہی پہلودار شخصیت ہیں جن سے خواتین کو متعارف کروانے میں تاخیر کا مجھے دکھ ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم روز مرہ کی زندگی میں کئی لوگوں سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے درمیان رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کو جاننے اور ان کے کردار کی خوشبو سے اپنے ذہن کے دریچوں کو مہکانے کا موقعہ اس لئے نہیں ملتا کہ ہم ان سے ملتے تو ہیں لیکن انہیں جانتے نہیں۔ ان سے رابطہ تو رکھتے ہیں لیکن ہمارے درمیان ذہنی ہم آہنگی اور باہمی پہچان کا خوبصورت رشتہ استوار نہیں ہوتا۔ یہ وہ رشتہ ہے جس کے ذریعے ہم دوسروں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ان کے دلوں اور پھر روحوں میں جھانک کر ان کی حقیقتوں کو پالیتے ہیں اور پھر شناخت اور پہچان کے اس عمل سے بڑا خوبصورت سا ریشمی لیکن مضبوط بندھن دلوں کے درمیان بندھ جاتا ہے۔

جب میں انٹرویو کرنے شہناز مزمل کے سامنے بیٹھی تھی تو ہمارے درمیان بھی کچھ ایسا ہی بندھن ذہنی رابطہ اور ہم آہنگی کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں۔

شہناز مزمل سب سے پہلے ایک اچھی انسان ہیں پھر ایک مثالی ماں ایک کامیاب خاتون خانہ ایک محنتی ورکنگ وومن ایک فرض شناس بیوی ایک قابل تقلید افسر ایک خوبصورت شاعرہ اور پھر ایک ذہین اور باصلاحیت عورت ہیں۔

شہناز مزمل کی شخصیت اور کردار کے ان تمام پہلوؤں کے اندر جھانکنے کے لئے میں ان دریچوں کے پٹ کھولے بیٹھی تھی۔ جو ذہنوں کے اندر اور کہیں دل کی گہرائیوں میں روشنی خوشبوؤں رنگوں اور چاندنی ایسی ٹھنڈک جیسے احساسات تخلیق کرتے ہیں۔ شہناز مجھے ایک ایسی کتاب نظر آ رہی تھیں جس کا ہر ورق ان کی صلاحیتوں کا امین ہے۔

گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری کے نفیس اور صاف ستھرے ماحول میں شیلفوں اور الماریوں میں آراستہ ہزاروں کتابوں کے درمیان مجھے شہناز مزمل کی شخصیت کی کتاب کا مطالعہ کرنا بہت خوش کن محسوس ہو رہا تھا۔ ایک انوکھا تجربہ تھا کہ کاغذی کتابوں کے درمیان ایک زندہ کتاب کا مطالعہ کرنا بلکہ شہناز تو خود مجھے ایک مجسم لائبریری محسوس ہوئیں کہ جن لوگوں کی اندر اتنی صلاحیتیں پہلو در پہلو یا پرت در پرت موجود ہیں انہیں آپ اور کیا نام دیں گے۔ اگر علمی اور ادبی صلاحیتوں کا اس قدر مجموعہ ہو۔ وہاں آپ اس شخصیت کو ایک مطالعہ گاہ کا نام دیتے ہیں اس کا اندازہ آپ شہناز مزمل کی علمی و ادبی سماجی پیشہ وارانہ اور انتظامی سرگرمیوں سے لگا سکتے ہیں یہ فہرست کچھ طویل ہے لیکن آپ دیکھئے کہ ایک خاتون کس قدر جذبوں سے پر زندگی سے بھرپور اور سرگرم عمل ہے۔

۱۹۸۴ء میں لائبریری شپ سے منسلک ہوئیں۔

۱۹۸۹ء سے دوبارہ ادبی سفر کا آغاز کیا۔

۱۹۹۰ء تک مندرجہ ذیل کتب منظر پر عام پر آچکی ہیں۔

## تصانیف

۱۔ کتابیات اقبال

۲۔ کتابیات مقالہ جات

۳۔ پیام نو۔ (شاعری)

۴۔ جذب و حروف (شاعری)

۵۔ جرات اظہار (شاعری)

۶۔ میرا خواب ادھورا ہے (شاعری۔ زیر طبع

۷۔ فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار

۸۔ لائبریریوں کا شہر لاہور (گائیڈ بک)

۹۔ نماز

شہناز مزمل کی فروغ مطالعہ سے متعلق صلاحیتوں عملی کاوشوں اور اس ضمن میں پرجوش عزائم سے متاثر ہو کر قائداعظم لائبریری کے چیف لائبریرین شیر افگن ملک نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے۔ شہناز مزمل کی فروغ مطالعہ کے سلسلہ میں ہر کاوش قابل ستائش ہے۔ شہناز بچوں کی لائبریرین شپ میں جو گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس کے باعث ایک قابل توجہ موضوع سامنے آیا ہے۔ ان سے اس ضمن میں کئی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں کہ وہ فروغ مطالعہ کی اس تحریک کو آگے بڑھاتی رہیں گی۔ شہناز مزمل کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ پنجاب کی تمام مطالعہ گاہوں یا لائبریریوں میں پہلی انچارج لائبریرین ہیں۔ ماڈل ٹاؤن جیسے وسیع و عریض اور متمول علاقہ میں لائبریری کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ اس

لائبریری کی بنیاد ہی شہناز مزمل نے رکھی۔ ڈائریکٹر جنرل لائبریریز نے انہیں یہاں منتظم مقرر کیا۔ تب سے شہناز نے اپنے ذوق و شوق مطالعہ اور کتابوں سے اپنی محبتوں اور عقیدتوں کے اظہار کے طور پر اس دارالمطالعہ کے ہر شعبہ کو آراستہ کیا۔ بعض لوگ کوئی کام انجام دینے کے لئے پیدائشی طور پر اہل ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا مقصد اس کام سے وابستہ ہوتا ہے۔ شہناز مزمل بھی ایسے لوگوں میں شمار ہوتی ہیں جو کسی مقصد کی تکمیل کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ انہی پیدائشی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ذمہ کام کے ہر پہلو کو سنوارتے اور مکمل کرتے ہیں۔ شہناز کی زندگی کے کئی مقاصد ہیں جن کی تکمیل میں وہ ہمہ تن مصروف نظر آتی ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ اس لائبریری میں ۱۸ ہزار کتابیں ہیں اور پندرہ سو ممبران ہیں۔ یہ لائبریری ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ یہاں صرف لوگ مطالعہ کے لئے ہی نہیں آتے بلکہ فروغ مطالعہ کے متعلق کئی پروگراموں میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ بچوں میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دینے کے لئے انہیں مختلف انداز میں ترغیب دی جاتی ہے۔ ٹیلنٹ شو اور کتابوں کی نمائشوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پنجاب کی تاریخ میں انہوں نے پہلی بار یہاں ۱۹۸۹ء میں سرائیکی زبان میں مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ جس سے ملک کے تمام علاقوں سے شعراء کو مدعو کیا گیا۔ شہناز کے اندر اپنے کام سے جو لگاؤ ہے جو تحریک ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک صحیح مقام پر ایک صحیح خاتون ہیں۔ خواتین میں ذوق مطالعہ سے متعلقہ پھر سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شہناز نے کہا کہ ہماری خواتین زیادہ تر علمی کتابیں نہیں پڑھتیں بلکہ فیشن یا ناول زیادہ دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین زیادہ تر محرومیوں اور معاشرتی ناہمواریوں کا شکار ہیں۔

انہوں نے کہا پیشہ ورانہ پہلو سے دیکھا جائے تو لائبریرین کا پیشہ خواتین کے لئے بے حد باوقار ہے۔ اس وقت لاہور میں ۱۳۰ لائبریریاں ہیں۔ شہناز نے کہا کہ لوگوں میں مطالعہ کا رجحان نہیں اس رجحان کو تقویت پہنچانے یا آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ سکولوں کی لائبریریوں میں کتابیں نہیں ہوتیں۔ لائبریریوں کی حالت زار دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کیونکہ اس صورت حال میں ذوق مطالعہ کو فروغ نہیں دیا جاسکتا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے طور پر فروغ مطالعہ کے لئے ہر ممکن طریق کار اختیار کر رہی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اس لائبریری کو جدید انداز اور سائنسی بنیادوں پر اس کے تمام شعبوں میں تبدیلیاں لاؤں۔ بچوں کے شعبہ میں بچوں کی دلچسپی اور ذوق کے مطابق کتابوں کے علاوہ کہانیوں کے وڈیو کیسٹ بنا رہی ہوں۔ تاکہ بچے زیادہ سے زیادہ سیکھ سکیں۔ لائبریری کے یوم تاسیس پر ڈراموں کا پروگرام کراتی ہوں اس میں بھی کچھ انفرادیت پیدا کرتی ہوں اور دنیا کے کسی بھی ملک میں بچوں کا کوئی مسئلہ درپیش ہو میں اس موضوع پر ڈرامے لکھ کر لائبریری کے ممبر بچوں سے پیش کرواتی ہوں۔ بچوں میں مذہبی لگاؤ پیدا کرنے کے لئے بچوں کے لئے نماز کی مووی بنا رہی ہوں جسے دیکھ کر بچوں کو نماز پڑھنے کی ترغیب ملے گی۔ انہوں نے لائبریری میں درس دینے کا اہتمام کر رکھا ہے تاکہ لوگوں کو دینی باتوں کی

طرف مائل کیا جاسکے۔
شہناز مزمل نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ کئی لوگ کتابیں پڑھنے کے لئے لے جاتے ہیں تو گم کر دیتے ہیں یا کتابوں کے اندر سے صفحے کاٹ لیتے ہیں کئی بار تو کتابوں کی صرف جلد یں رکھ دیتے ہیں۔ اندر سے کتابیں چرا لیتے ہیں۔
اس طرح ایک لائبریرین کو ڈیڑھ لاکھ روپے بھرنے پڑے۔ جب میں نے شہناز مزمل سے یہ پوچھا کہ ان کی ان کامرانیوں کے پس پردہ کیا عوامل کارفرما ہیں تو شہناز کے چہرے پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی وہ کہنے لگیں جیسے ایک کامیاب شوہر کی کامیابیوں کے پس پردہ ایک بیوی کا ہاتھ ہوتا ہے اور ویسے بھی بیوی کی پرسکون باعمل اور مطمئن زندگی پیشہ ورانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے پیچھے بھی شوہر کا تعاون اور حوصلہ افزائی جیسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے شوہر بھی ایک باذوق عالم اور اعلیٰ ظرف شخص ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں اپنے شوہر کی وجہ سے ہوں۔ ورنہ میں بھی ان لاکھوں عورتوں میں سے ایک ہوتی جن کی تمام صلاحیتیں باورچی خانہ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں اور وہ خود بھی زندگی بھر اس غم سے باہر نہیں نکل سکتیں کہ وہ بے مقصد زندگی بسر کر رہی ہیں۔
شہناز نے بتایا کہ ان کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ صرف ایف اے کیا تھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد تعلیم مکمل کی۔ اس وقت ان کی بڑی بیٹی نعمانہ سلطان ایف اے کر رہی ہے اور انہیں بھی لکھنے کا شوق ہے۔ چھوٹی بیٹی میمونہ سلطان انگریزی زبان میں شاعری کرتی ہیں۔ شہناز کے شوہر کاروبار کرتے ہیں۔ انہوں نے لاء کیا ہوا ہے وہ ایک باشعور شخص ہیں انہوں نے میری صلاحیتیں نکھارنے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں نے تعلیم حاصل کی۔ کتابیں لکھیں۔ شاعری کی اور ملازمت کر رہی ہوں یہ سب کچھ میں شوہر کے تعاون سے کرتی ہوں۔
ہمارے معاشرے میں خواتین کی صلاحیتوں کو تسلیم نہ کرنے کا رویہ عام ہے جس سے کئی سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اپنے میاں کی بھرپور توجہ اور تعاون حاصل ہے۔ زندگی خوش و خرم اور مطمئن ہے۔ آپ نے شاعری کب شروع کی۔ اس سوال پر شہناز نے بتایا کہ ان کے والد شاعر تھے۔ جن کی زندگی میں شہناز نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ وہ کبھی شاعری بھی کریں گی۔ لیکن والد کے انتقال کے بعد صرف چند سال پہلے شاعری کا آغاز کیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی بنجر چٹان سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے۔ شاید یہ صلاحیت میرے اندر تھی اور اظہار کا موقع ملنے پر آمد ہونے لگی۔ پہلا مجموعہ کلام پیام نو چھپا۔ پہلے میں بچوں کے لئے نظمیں لکھتی تھی پھر سوچا کہ محدود نہ ہو جاؤں۔ میں اپنے گرد و پیش جو دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں لکھتی ہوں۔ میری شاعری میں کہیں پیغام ہوتا ہے۔ کہیں نصیحت ہوتی ہیں۔ میں نظمیں غزلیں اور نعتیں لکھتی ہوں۔ زیادہ لطف مجھے نظم کہنے میں آتا ہے۔ کیونکہ نظم میں ایک تسلسل اور ایک روانی ہوتی ہے جبکہ غزل میں پابند ہونا پڑتا ہے۔ شہناز نے مجھے ایک نظم سنائی۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

## وارث زنداں

کچھ وحشی تمناؤں کے مجرم ہیں یہاں بھی
خمیازہ توہین جہاں ملتا ہے جن کو
اس گردش دوراں کو بنا مری بیڑی
اک گوشہ تاریک میں پھینکا گیا مجھ کو
اب راز دار ہیں مرے سارے درو دیوار
خوش آگئی ہے وحشت تنہائی خونبار
اس کنج قفس کو تو نہ چھینو کوئی مجھ سے
میں وارث زنداں ہو
مجھے کوئی تو حق دو

شہناز سے ملنے کے بعد میں نے اس لائبریری کا سرسری جائزہ لیا۔ جسے شہناز نے اپنی برسوں کی محنت سے سنوارا اور توجہ سے اس پودے کو بیج کر قدر آور درخت بنایا ہے۔ لائبریری کے انتظام میں مجھے صاف طور پر ایک عورت کی فطری نفاست اور تنظیم و ترتیب کے انداز نظر آئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ کئی شعبے ایسے تھے کہ اگر وہاں سٹاف کی کمی نہ ہو تو کارکردگی کا معیار بہتر ہو جائے۔ بہرحال اس کمی میں شہناز مزمل کا تو کوئی ہاتھ نہیں۔ انہوں نے تو اس لائبریری کو حتی المقدور ایک مثالی دارالمطالعہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کام تو خود بولتا ہے اور نظر آتا ہے اور جہاں شہناز مزمل جیسی باذوق اعلیٰ تعلیم یافتہ مخلص اور تخلیقی جذبوں سے معمور خواتین ہوں۔ وہاں ماحول میں زندگی اور تحریک جذبے اور کام ساتھ ساتھ پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ کاش! زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی خواتین کو صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ تو کام کرنے کی جگہیں اور ماحول کس قدر بامقصد پرسکون اور معطر سے لگنے لگیں۔ ایسا ہو سکتا ہے؟

بشکریہ:۔ روزنامہ امروز لاہور

# روزنامہ پاکستان

## انٹرویو = ڈاکٹر اجمل نیازی

شہر لاہور میں ایک بستی ہے جسے ماڈل ٹاؤن کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ شہر سے دور ایک ویرانے میں آباد تھی اب اس سے بھی آگے شہر پھیلتا چلا گیا ہے۔ ماڈل ٹاؤن واقعی ہی ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ یہاں امیر لوگ رہتے ہیں مگر ان میں سے زیادہ تعداد پڑھے لکھے مہذب اور معزز لوگوں کی ہے۔ فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری جیسے شاعر کا ڈیرہ بھی یہی تھا۔ اس بستی میں سب کچھ ہے یہاں ماڈل ٹاؤن لائبریری ایک قابل ذکر جگہ ہے۔ خوبصورت عمارت کو ایک سلیقے سے بنایا گیا ہے۔ یہاں کتابیں اتنے قرینے سے سجائی گئی ہیں کہ مطالعے کے لئے جی نہ بھی کرتا ہو تو بھی یہاں کچھ دیر رہنے کے لئے دل ضرور کرتا ہے۔ کتابیں گھروں کی طرح ہوتی ہیں ان میں رہنا چاہئے۔ اس لائبریری کو تو کتاب گھر بھی کہا جاسکتا ہے۔ لائبریری واقعی گھر ہے مگر ہم یہاں بھی بے گھری کا شکار رہتے ہیں۔ مطالعہ سے ہمارا رابطہ ٹوٹا ہے تو اپنے گھر میں بھی اجنبی ہونے کے احساس نے ہمیں آلیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ایک بچی عورت جہاں کھڑی ہو جاتی ہے وہاں گھر بن جاتا ہے۔ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی انچارج محترمہ شہناز مزمل ایک اعلیٰ ذوق کی خاتون ہیں۔ 1986ء میں لائبریری کی پہلی نگران بن کر آئیں۔ نہ صرف لائبریری کو ایک خوبصورت گھر کا انداز دیا بلکہ ماڈل ٹاؤن والوں کے لئے اس جگہ کی ایک کشش عام کی۔ خاص طور پر عورتوں اور بچوں کو اس طرف مائل کیا۔ محترمہ شہناز نے لائبریری کو ایک ادارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اب ماڈل ٹاؤن میں اس لائبریری سے زیادہ آسودگی، کشادگی اور تازگی کہیں نہیں ملتی۔ ہرروز سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں۔ یہاں سے کتابیں لے کے جانے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ ماڈل ٹاؤن کی آدھی سے زیادہ آبادی شہناز کی واقف ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کی نرمی اور محبت سے لوگوں کو گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اگر اداروں میں اس طرح کے لوگ ہوں تو ایک خوبصورت ماحول قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہاں وہ پڑھنے والوں کی رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ وہ خود ایک بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے چار شعری مجموعے ہیں۔ پیام نو، جرات اظہار، جذب و حروف اور عکس دیوار پر تصویر تین کتابیں لائبریری سائنس کے حوالے سے ہیں۔ فروغ مطالعہ اور کتاب دوستی کا موضوع شہناز صاحبہ کو بہت پسند ہے۔ لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد شہناز صاحبہ نے ڈی ایچ ایم ایس کا چار سالہ کورس بھی کیا ہے۔ انہیں ڈاکٹر کہنا چاہئے

مگر وہ اسے پسند نہیں کرتیں۔ البتہ اب ان کی ایک بیٹی ایم بی بی ایس کر رہی ہے۔ شہناز صاحبہ نے کئی ملکوں کے سفر کیے ہیں اور بہت کچھ سیکھا ہے۔ انہیں دوسرے ملکوں میں ملازمت کی پیشکش بھی ہوئی مگر وہ اپنے وطن کی خدمت کو اپنا ایمان سمجھتی ہیں۔

شہناز صاحبہ اپنی لائبریری کے ملازمین کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہیں۔ دفتر کے شعبہ خواتین میں کام کرنے والی حمیرا رشید صرف میٹرک تھی اب وہ بی اے تک پہنچ گئی ہے۔ لائبریری کا چوکیدار نائب قاصد اور کلرک بھی بی اے کر چکے ہیں۔ ایک آدمی نے ایم اے بھی کر لیا ہے۔ ایک علمی ماحول تعمیر کیا گیا ہے سب چھوٹے بڑے یہاں ایک کی طرح رہتے ہیں۔ حمیرا رشید لائبریری میں آنے والی خواتین کا خیر مقدم اس طرح کرتی ہیں جیسے وہ ان کے گھر میں آئی ہوں۔ شہناز صاحبہ اور لائبریری کا تمام سٹاف یہاں آنے والوں سے ذاتی طور پر آشنا ہے۔ یہاں صبح سویرے درس و تدریس سے دن کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اور ہر روز اس عزم اور ایما کے ساتھ کام شروع کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی خدمت کی جائے۔ شاید لاہور کی تین سو سے زائد لائبریریوں میں یہ واحد لائبریری ہے جسے ایک پناہ گاہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں۔ خواتین کی تقریبات بھی منعقد ہوتی ہیں۔ اس طرح لائبریری کو ایک رابطہ مرکز کی حیثیت بھی ملتی جا رہی ہے۔ بچوں اور طالب علموں کی سوسائٹی بھی اپنا کام کرتی ہے۔ ادب سرائے اور حلقہ تجدید سخن کے نام سے ادبی تنظیمیں بھی بنائی گئی ہیں اب یہ ادارہ بچوں اور عورتوں کے لئے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتا ہے۔

شہناز صاحبہ کے شوہر سلطان صاحب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں وہ روزانہ لائبریری آتے ہیں مگر اس سلسلے میں وہ رشتہ داری کا فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ لائبریری کے لائف ممبر ہیں ان کے بچے بچیاں سب لائبریری کے ممبر ہیں۔ وہ جب کسی کو لائبریری کی ممبرشپ کے لئے کہتی ہیں تو ان کی بات میں وزن ہوتا ہے۔ کتابیں دوست ہوتی ہیں مگر یہ باتیں بیویوں کو بتانے والی نہیں۔ کتاب کے ساتھ دوستی ایسی ہے جیسی کسی بھی بچی عورت سے ہو سکتی ہے۔ عورت دوسری عورت کی زیادہ راز دار دوست ہو سکتی ہے۔ محترمہ شہناز کی لائبریری میں کتابوں کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے محترمہ شہناز ایک کثیر الاحباب خاتون ہیں۔

ہمارے ملک میں جس طرح فحش وڈیو کیسٹوں کا کاروبار چل نکلا ہے۔ ایک زمانے میں فحش کتابیں بھی ایک تجارت کا انداز اختیار کر گئی تھیں۔ یہ شوق کچھ لوگوں کو منشیات کی طرح لگ جاتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ مطالعے کی کمی کی وجہ سے یہ رجحان کم ہوا ہو۔ اب لوگ جاسوسی ناول بھی کم پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کی عادت نہ ہونا بذات خود ایک بیماری ہے۔ مغربی ممالک میں بھی ویڈیو کا کاروبار ہے اس کے باوجود لوگوں کو مطالعے کا شوق ہے۔ وہاں ایک کتاب لاکھوں میں شائع ہوتی ہے۔ جو آدمی کتاب لکھ لے وہ امیر کبیر ہو جاتا ہے ایک پاکستانی جاپان گیا۔ وہاں گاڑی پر ایک سفر کے دوران اس کی حیرت کی

انتہا نہ رہی جب ہر آدمی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ اگر آدمی تیرہ دن تک مطالعہ چھوڑ دے تو اس کی شخصیت میں سے نفاست اور لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے ماحول میں پھیلی ہوئی بے زاری اور بے عملی دیکھیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مطالعے کے فقدان نے ہمارے اندر کیا کیا تباہیں پیدا کر دی ہیں۔ محترمہ شہناز مزمل لوگوں کے پڑھنے کے شوق کو زندہ کر رہی ہیں۔

شہر لندن کے ہر محلے میں ایک خوبصورت لائبریری ہے وہاں مجھے رچی لیمنگ محلے کی لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ ماڈل ٹاؤن لائبریری کا سٹائل اور انداز مجھے زیادہ بہتر محسوس ہوا۔ ماڈل ٹاؤن لائبریری میں محترمہ شہناز مزمل سے جو گفتگو ہوئی وہ نذر قارئین ہے۔

شہناز = مجھے گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی بانی منتظم ہونے کا شرف حاصل ہے اس کا قیام 1986ء میں عمل میں آیا۔ اس وقت 20000 کتب کے ساتھ یہ لائبریری 2300 ممبران کی مطالعاتی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اور اس لائبریری سے نہ صرف اہالیان ماڈل ٹاؤن بلکہ ٹاؤن شپ' گرین ٹاؤن' مسلم ٹاؤن' فیصل ٹاؤن' جوہر ٹاؤن' گلبرگ' علامہ اقبال ٹاؤن اور اطراف میں موجود آبادیوں کے مکین بھی استفادہ کر رہے ہیں۔ روزانہ 200 سے 250 افراد پڑھنے کے لئے آتے ہیں اور تقریباً 300 سے 400 کتب روزانہ اشو کی جاتی ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد بھی اس کی ممبر ہے۔ پاکستان کتب بینی کے عنوان سے مضمون لکھنے کے لئے مختصر جواب کیا ہو گا۔

شہناز = اگر ہم کتب بینی کی عادت اپنا لیں تو ایک عظیم قوم بن سکتے ہیں۔ اس طرح ہماری سوچ تخریبی بننے کی بجائے تعمیری بن جائے گی۔

گلی گلی میں کرکٹ ہوتا ہے ہر محلے میں لائبریری کیوں نہیں؟

شہناز = قوم کے سامنے کرکٹ کے کھلاڑیوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس لئے گلی گلی کرکٹ رواج پا رہا ہے اگر قوم کو لائبریری مائنڈڈ بنایا جائے اور مختلف حوالوں سے لائبریریوں کی اہمیت کو واضح کیا جائے تو ہر گھر میں لائبریری ہو گی۔

ایک زمانے میں آنہ لائبریریاں ہوتی تھیں کیا اب یہ صورت ممکن نہیں؟

شہناز = اب ضرورت کھو کھا لائبریریوں کی نہیں۔ آج کے دور کا تقاضا ہے کہ لوگوں کو ریسرچ کی طرف مائل کیا جائے اور ہر کام قومی سطح پر ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں کس طرح کی کتابیں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔

شہناز = مجھے افسوس کے ساتھ اس چیز کا اعتراف کرنا ہے کہ ابھی تک عوام سطحی مواد کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ غیر سنجیدہ' بے معنی اور محض تفریحی تحریریں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ اس میں گھٹیا ناول اور جاسوسی کتب وغیرہ شامل ہیں۔ سنجیدہ موضوعات کے قارئین ان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

ایسی کتاب جو کسی نے نہ نکلوائی ہو؟

ادیبہ سلطانہ

شہناز مزمل لاہور کی ایک معروف ادبی شخصیت ہیں۔ کم عمری میں شادی کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکیں مگر شادی کے بعد انہوں نے ایک دانشور مجاہدہ کی حیثیت سے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دی اور ذاتی محنت و لگن کے طفیل آج پاکستان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی صف میں کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ شہناز مزمل نے ۱۹۸۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا۔ ۱۹۸۹ء میں فرانسیسی زبان، ۱۹۹۰ء میں کمپیوٹر سائنس اور انتظامی امور کے کورسز کئے۔ ۱۹۹۱ء میں لاہور سے ہومیو پیتھی میں ڈی ایچ ایم ایس حاصل کیا۔ آج کل گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور کی ڈائریکٹر ہیں جہاں ان کا بیشتر وقت تصنیف و تالیف، لیکچرز کی تیاری کے علاوہ فروغ مطالعہ اور ادبی سرگرمیوں کے اجراء میں گزرتا ہے۔ وہ پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن کی کونسلر، انجمن طلبہ قدیم کی جائنٹ سیکرٹری، انٹرنیشنل ویمن ایسوسی ایشن کی رکن، قادری ویلفیئر سنٹر کی ڈائریکٹر اور حلقہ تجدید سخن اور ادب برائے ماڈل ٹاؤن کی صدر بھی ہیں۔ شہناز مزمل کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ریڈیو پاکستان ملتان سے نشر ہونے والی پہلی نسوانی آواز انہی کی تھی۔ انہوں نے دو مرتبہ ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور گورنر پنجاب ادبی ایوارڈ برائے ۱۹۹۰ء بھی حاصل کئے۔ ایک مہذب، شائستہ، باہمت اور مثالی علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے شہناز مزمل کے ساتھ جو گفتگو ہوئی وہ نذر قارئین ہے۔

س:- ادب میں آپ کی دلچسپی کب اور کیسے شروع ہوئی؟

ج:- گو کہ ادب سے مجھے شروع سے ہی دلچسپی تھی مگر ۱۹۸۶ء میں میرے والد کی وفات کے بعد مجھے اظہار کی ضرورت محسوس ہوئی۔

س:- ادب میں آپ کی دلچسپی کی صنف اور موضوع کیا ہیں؟

ج:- غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں گو نظمیں زیادہ ہیں اور موضوعات بے شمار۔

س:- آپ نے اب تک کتنے مشاعروں میں شرکت کی ہے؟

ج:- میں نے اب تک بہت سارے مشاعروں میں حصہ لیا ہے۔ ماڈل ٹاؤن لائبریری میں بھی کئی مشاعرے منعقد کروائے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر خواتین کے مشاعرے میں بھی حصہ لیا ہے۔ لائبریری میں سرائیکی مشاعرے بھی منعقد ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بریڈ فورڈ

شہناز:۔ یہ درست ہے کہ مرد عورت کی قابلیت کو تسلیم کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن میرے میاں ذرا مثبت سوچ کے حامل ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ میرے سامنے اتنا زیادہ میری خوبیوں کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن وہ انہیں دل سے تسلیم ضرور کرتے ہیں شاید ان کا یہ اظہار نہ کرنا بھی کسی تعمیری جذبے کا حامل ہو۔ اگر اپنی کوئی چیز انہیں دکھاتی ہوں تو اسے مزید اچھا بنانے کے لئے کہتے ہیں۔

شبیر:۔ آپ کی دو بیٹیاں اس وقت آپ کے ہمراہ ہیں ان میں بھی ادبی ذوق موجود ہے؟

شہناز:۔ جی ہاں۔ میری چھوٹی بیٹی میمونہ انگلش شاعری کرتی ہے اور بڑی بیٹی اپنا اظہار پینٹنگ کے ذریعے کرتی ہے اس کے علاوہ وہ ایک اخبار میں بچوں کا صفحہ بھی ایڈیٹ کرتی ہیں ادبی ذوق دونوں میں موجود ہے مگر تعلیمی مصروفیات کی بناء پر زیادہ وقت نہیں دے پاتیں۔

شبیر:۔ آپ گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لاہور کی چیف لائبریرین ہیں آپ خود بھی جی بھر کر مطالعہ کرتی ہوں گی لوگ بھی آتے ہوں گے کیا محسوس کرتی ہیں؟

شہناز:۔ بہت اچھا محسوس ہوتا ہے بہت سے لوگوں سے ملاقات رہتی ہے تقریباً" ہر کتاب میرے ہاتھ سے ہو کر گزرتی ہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا کرتی ہوں کہ جو کتابیں مجھے پسند آجائیں میں اپنے دراز میں رکھ لیتی ہوں تاکہ کوئی اور نہ لے جائے اور وقت ملتے ہی پہلے خود پڑھ سکوں۔ لیکن اس کا وقت بھی بہت کم ملتا ہے۔ مجھے شاعری کے علاوہ تنقید اور سفرنامے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔

شبیر:۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے کہ ہمارے ہاں لائبریریوں کی تعداد کم ہے؟

شہناز:۔ میں عرض کروں کہ پاکستان میں لائبریریوں کی تعداد کم نہیں ہے پچھلے دنوں میں نے ایک سروے کیا کہ اس وقت صرف لاہور میں تین سو ایک لائبریریاں موجود ہیں جو اچھی خاصی تعداد ہے۔ اصل میں ہمارے ہاں کمی ہے تو لائبریری ایجوکیشن کی ہے اصل میں سکول کی لائبریریاں ذوق مطالعہ بڑھانے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لئے ہمیں سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ اس کے علاوہ پبلک لائبریریاں بھی بہت کم ہیں۔

قمر:۔ شاعری اور نثر کس اصناف میں لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتی ہیں؟

شہناز:۔ نثر کے حوالے سے تو میں اپنے سبجیکٹ (لائبریری) کے متعلق کچھ کام کیا ہے۔ فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار' لائبریروں کا شہر لاہور (گائیڈ بک) وغیرہ لکھ چکی ہوں۔ مذہبی حوالے سے ایک کتاب "نماز" کے موضوع پر بھی چھپ چکی ہے۔ شاعری میں زیادہ تر نظم مجھے آسان ذریعہ اظہار لگتا ہے۔ اصل میں نظم میں ایک ہی قسم کے خیال کو بیان کرنا ہوتا ہے تو وہ باقی اصناف سخت کی نسبت ذرا آسان کام ہے نظم میں اتنی روانی ہوتی ہے کہ مجھے نظم لکھتے ہوئے بہت لطف آتا ہے۔

شبیر:۔ شہناز صاحبہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

بشکریہ:۔ روزنامہ عوام فیصل آباد

کنیز اسحاق:- شہناز! آپ کی شاعری کا سفر کتنا طویل ہے؟
شہناز:- میں تین سال سے شاعری کر رہی ہوں، اور اس دوران میرے تین مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آ چکے ہیں اور ابھی میں خود کو ادب کے میدان میں بہت کم مایہ سمجھتی ہوں یعنی میں نے کبھی بڑی شاعرہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔
شبیر:- آپ کو شاعری کرتے ہوئے ابھی تین سال ہوئے اور آپ کے تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ حالانکہ اکثر شاعر کئی کئی برس تک ایک بھی مجموعہ مکمل نہیں کر پاتے کیا محسوس کرتی ہیں آپ؟
شہناز:- اصل میں میرا ایمان توکل ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی عطا ہے۔ خدا کا مجھ پر بڑا احسان ہے میں اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔
قمر:- آپ کو اپنے چاروں شعری مجموعوں میں سے زیادہ پسند کون سا ہے؟
شہناز:- مجھے "عکس دیوار پہ تصویر" جو میرا چوتھا شعری مجموعہ ہے زیادہ پسند ہے اس لئے کہ اس میں پہلے دو مجموعوں "جذوب حروف" اور "حرف۔ اظہار" میں سے منتخب کلام بھی شامل ہیں اس میں میچورٹی پہلے دو مجموعوں سے زیادہ ہے۔
کنیز اسحاق:- عورت ہونے کے حوالے سے آپ کو ادب کا میدان کیسا لگا؟
شہناز:- میرا خیال ہے کہ اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی خیالات میں فرق ضرور آ جاتا ہے کچھ ہمارے معاشرے کی اقدار کے لحاظ سے بھی ویسے عورت ہونے کے حوالے سے مجھے ادب کے میدان میں بہت اچھا لگا۔ دراصل مجھے اس میدان میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ اس میدان نے میرے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں مجھے شعور ذات بخشا ہے اور مجھے آگہی دی ہے۔
شبیر:- اپنی معاصر شاعرات میں سے کسی سے آپ نے اثر قبول کیا ہو؟
شہناز:- جی نہیں۔ میں نے دراصل کسی شاعرہ سے متاثر ہو کر شاعری شروع نہیں کی پھر بھی ادا جعفری کی شاعری کو میں کسی حد تک پسند کرتی ہوں۔
شبیر:- آپ کا عورت ہوتے ہوئے شاعری کرنا آپ کے گھریلو حالات پر تو کبھی اثر انداز نہیں ہوا؟
شہناز:- جی بالکل نہیں۔ بلکہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اپنے خاوند کی وجہ سے ہوں۔ میں نے تو اپنی تعلیم بھی شادی کے بعد مکمل کی ہے کیونکہ میری شادی بہت چھوٹی عمر میں ہو گئی تھی میرے میاں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں بھی میری بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں جو کچھ لکھتی ہوں پہلے ان کو سناتی ہوں وہ میرے ایک ایسے سامع ہیں جو بہت سکون سے میری چیزیں سنتے ہیں اور پھر ان پر تنقید بھی کرتے ہیں جو بڑی مثبت ہوتی ہے۔
قمر:- یہ حقیقت ہے کہ مرد عورت کی قابلیت کو تسلیم کرنے مشکل سے آمادہ ہوتا ہے خاص طور پر شوہر اپنی بیوی کے حوالے سے تو کیا آپ کے میاں آپ میں جو اضافی خوبیاں پائی جاتی ہیں ان کی تعریف کرتے ہیں؟

# روزنامہ عوام فیصل آباد

## انٹرویو شبیر احمد قادری

محترمہ شہناز مزمل کا تعلق فیصل آباد سے ہے یہی ان کی جنم بھومی ہے آج کل لاہور میں گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی چیف لائبریرین ہیں تین شعری مجموعے شائع ہو کر اہل قلم سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں "مجلس معین ادب" کے زیر اہتمام اپنے چوتھے مجموعہ کلام "عکس دیوار پہ تصویر" کی تعارفی تقریب کے سلسلہ میں فیصل آباد تشریف لائیں تو ہم نے قارئین شعروادب کے لئے ان سے کچھ باتیں کیں جو پیش خدمت ہیں۔

انچارج

شبیر:- محترمہ شہناز مزمل صاحبہ! آپ اپنے ہی شہر میں مہمان بن کر آئی ہیں۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اپنی ابتدائی شاعری کے بارے میں کچھ بتائیں؟

شہناز:- شکریہ شبیر صاحب! میں دراصل سکول کے زمانے ہی سے بچوں کے لئے لکھتی تھی چونکہ میرے والد صاحب حشر القادری مرحوم بھی شاعر تھے۔ وہ میری ان نگارشات کو دیکھ لیا کرتے تھے اور مناسب رہنمائی بھی فرمادیا کرتے تھے۔ لیکن جب تک والد صاحب حیات رہے میں نے باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ حالانکہ ان کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر قسم کا لٹریچر پڑھنے کی بھی اجازت تھی۔ بہر حال والد صاحب کے انتقال کے بعد میں نے باقاعدہ آغاز کیا۔ پھر تو ذہن نے ایسا اگلنا شروع کیا میں خود حیران ہو جاتی تھی کہ مسلسل سات آٹھ چیزیں ہو جاتیں۔ یہاں ایک بات یہ بھی واضح کر دوں کہ میں نے باقاعدہ شاعری کے اوزان سیکھنے کے بعد شاعری شروع نہیں کی یعنی مجھے علم عروض پر کوئی کمال حاصل نہیں۔ میں اصل میں شعر بحر میں نہیں لہر میں کہتی ہوں۔

شبیر:- اس کے باوجود کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تو طے کیا ہو گا؟

شہناز:- جی ہاں! شروع میں طفیل ہوشیار پوری صاحب کے پاس چلی جایا کرتی تھی جو میرے مناسب رہنمائی فرمادیا کرتے تھے لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا کہ وہ شعر کو اپنے مزاج سے ڈھال دیتے تو مجھے محسوس ہوتا لیکن ان کے سامنے اظہار نہ کرتی۔ ان کے علاوہ باقی دوستوں کے مشورے بھی کھلے دل سے مانتی ہوں۔

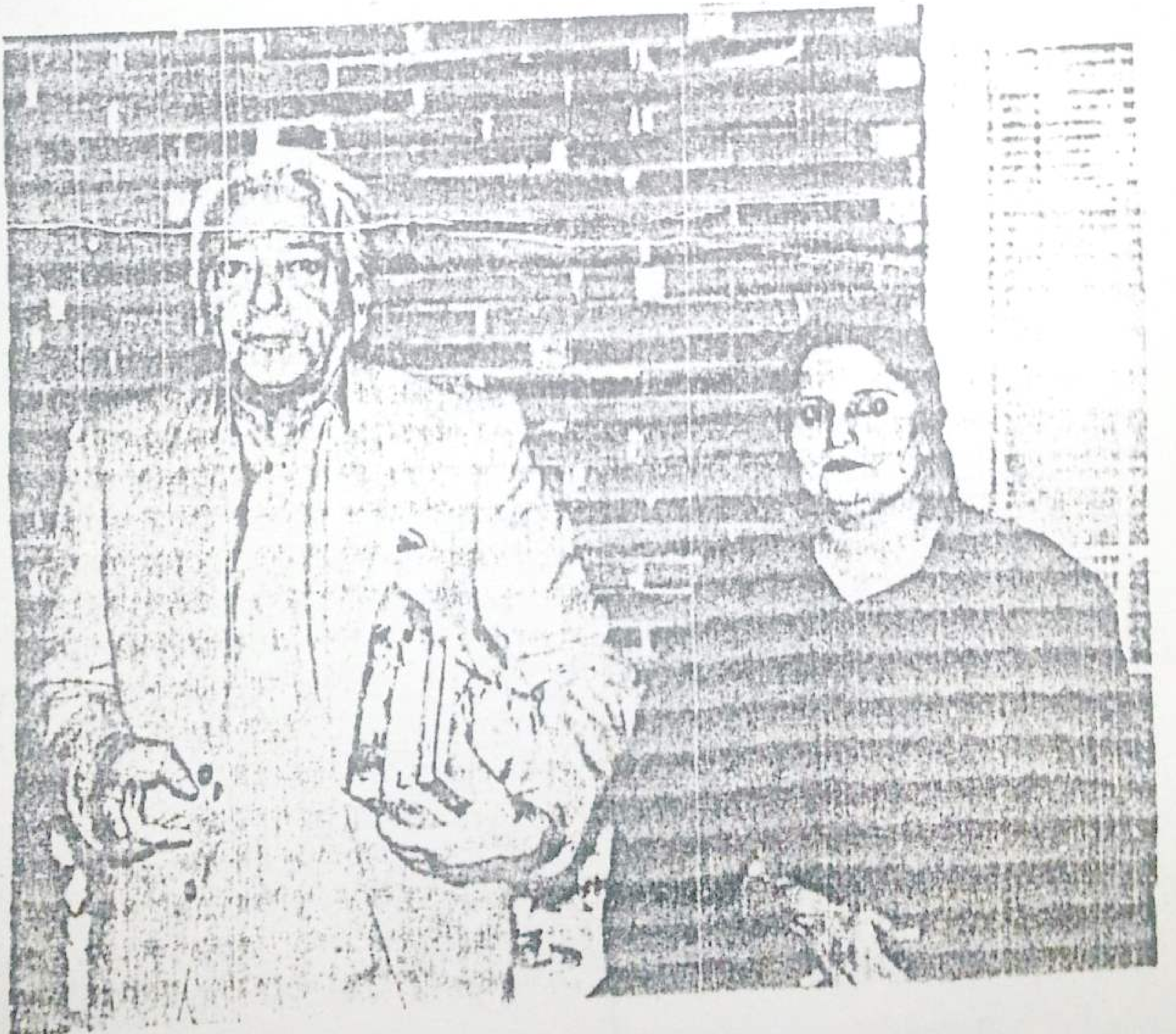
مزید کہ بچوں میں مذہبی لگاؤ پیدا کرنے کے لئے بچوں کے لئے نماز کی مووی بنا رہی ہوں اس کے علاوہ لائبریری میں درس دینے کا بھی اہتمام کر رکھا ہے۔

اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں شہناز نے بتایا کہ جب میری شادی ہوئی تو اس وقت میں صرف ایف اے پاس تھی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد میں دوبارہ تعلیم کی طرف راغب ہوئی اور اس سلسلے میں شوہر کی طرف سے ہر ممکن تعاون حاصل رہا۔

شہناز نے مزید کہا کہ جس طرح ایک مرد کی کامیاب یا ناکام زندگی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح عورت کی کامیاب یا ناکام زندگی کے پیچھے مرد کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے شوہر ایک باذوق اور اعلیٰ ظرف کے انسان ہیں اگر ان کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو میں بھی ان لاکھوں عورتوں میں سے ایک ہوتی جن کی تمام صلاحیتیں باورچی خانے میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔

شکریہ :- اخبار خواتین لاہور



لائبریری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے شہناز کہنے لگیں۔ "مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں پاکستان کی تمام لائبریوں کی میں پہلی انچارج خاتون لائبریرین ہوں۔ اس وسیع لائبریری کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا اور اس کی بنیاد میں نے ہی رکھی۔ چونکہ میں خود مطالعہ کی بہت شوقین ہوں اس لئے اس دار المطالعہ کے ہر شعبے کو سنوارنے مین اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لاتی ہوں۔

شہناز نے مزید بتایا کہ اس وقت اس لائبریری میں مجموعی طور پر اٹھارہ ہزار کتابیں ہیں اور پندرہ سو ممبران میں 'یہ لائبریری مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے اور یہاں لوگ صرف مطالعے ہی کے لیے نہیں آتے بلکہ فروغ مطالعہ کے متعلق کئی پروگراموں میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ خاص طور پر بچوں میں مطالعہ کی عادت کو فروغ دینے کے لئے انہیں مختلف انداز میں ترغیب دی جاتی ہے۔ لملنٹ شو اور کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

فروغ مطالعہ کے حوالے سے شہناز مزمل کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے قائداعظم لائبریری کے چیف لائبریرین شیرافگن صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "شہناز مزمل کی فروغ مطالعہ کے سلسلے میں ہر کاوش قابل ستائش ہے۔ بچوں کی لائبریرین شپ شہناز کی گہری دلچسپی کے باعث ایک قابل توجہ موضوع سامنے آیا ہے۔ ان سے اس ضمن میں کئی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں کہ فروغ مطالعہ کی اس تحریک کو آگے بڑھاتی رہیں گی۔"

بچوں میں مطالعہ کی عادت اور شوق کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے شہناز نے کہا کہ لوگوں میں مطالعے کی عادت آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہے میں اس سلسلے میں والدین اور اساتذہ دونوں کو قصوروار گردانتی ہوں ایسا بھی نہیں کہ ہمارے ہاں لائبریریوں کی تعداد کم ہے۔ ایک سروے کے مطابق اس وقت لاہور میں تین سو سے زائد لائبریریاں ہیں لیکن والدین اور اساتذہ بچوں کو مطالعے کی طرف راغب نہیں کرتے۔

شہناز نے مزید کہا کہ سروے کے دوران کئی سکولوں کی لائبریریاں دیکھیں ان کی حالت زار پر سخت ملال ہوا۔ والدین اور اساتذہ دونوں سے میری استدعا ہے کہ وہ بچوں کو وڈیو گیمز اور وی سی آر کی بجائے لائبریری کا راستہ دکھائیں جہاں انہیں صاف ستھرا مواد پڑھنے کو ملے۔ گھر میں ماحول ہو تو بچہ خود بخود پڑھنے لکھنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اچھی کتابوں کا مطالعہ زندگی کو صحیح طور پر گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں شہناز نے کہا کہ میں اپنے طور پر فروغ مطالعہ کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ میں اس لائبریری کے تمام شعبوں میں سائنسی بنیادوں پر تبدیلیاں لاؤں۔ بچوں کے شعبے میں ان کی دلچسپی اور ذوق کے مطابق کتابوں کے علاوہ کہانیوں کے وڈیو کیسٹ بنارہی ہوں تاکہ بچے زیادہ سے زیادہ سیکھ سکیں۔

# اخبار خواتین

## انٹرویو = کوکب شکیل

شہناز مزمل ---- دنیا شعروادب کا ایک معتبر نام ہے۔ دھیمے لہجے میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنے والی اس ہمہ پہلو شخصیت نے آغاز شعور سے پہلے ہی شعروادب کو زندگی کا حاصل بنانے کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔

بقول شہناز کے "میرے والد مرحوم حشر القادری صاحب خود بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کا مجھ پر بہت اثر تھا ویسے تو میں سکول کے زمانے سے ہی بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی اور والد صاحب اس سلسلے میں میرے رہنمائی بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی میں میں نے باقاعدہ شاعری نہیں۔ ان کی وفات کے بعد تو جیسے چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ میں خود حیران تھی کہ کس طرح شعر پہ شعر لوح دل پہ رقم ہوئے جا رہے ہیں۔ شاید والد صاحب کی جدائی دل پر چوٹ بن کر لگی تھی۔"

شہناز کو شاعری کرتے ابھی چند برس ہی گزرے ہیں اور ان کے چار مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "پیام نو" ان کا پہلا مجموعہ تھا۔ پھر "جرات اظہار" "جذب و حرف" اور "عکس دیوار پہ تصویر" جب کہ پانچواں مجموعہ "میرا خواب ادھورا ہے" زیر طبع ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں کتابیات اقبال' کتابیات قالہ جات' نماز' فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار اور لائبریریوں کا شہر لاہور شامل ہیں۔ "لائبریری" شہناز کا اپنا مضمون ہے اس لئے یہ تمام تصانیف اسی حوالے سے ہیں۔

شہناز کی شخصیت کی ایک پہچان تو شعروادب کے حوالے سے ہے۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر اور لائبریرین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب گھریلو خاتون بھی ہیں۔

انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے لائبریری سائنس کیا اور اسی دوران فرانسیسی زبان بھی سیکھی' دو سال تک ایک مقامی گرلز کالج میں بطور لائبریرین کام کرنے کے بعد آج کل گورنمنٹ کالج ماڈل ٹاؤن میں منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں اور اسے حوالے سے ایوارڈ حسن کارکردگی حاصل کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی محافل اور مشاعرے بھی منعقد کرواتی ہیں اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کام کرتی ہیں۔

شہناز کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ۱۹۸۹ء میں لاہور میں پہلا بڑا سرائیکی مشاعرہ منعقد کروایا۔ جس میں ملک کے ممتاز سرائیکی شعرا کے ساتھ ساتھ مشہور گلوکار عطاءاللہ خان عیسیٰ خیلوی نے بھی بطور خاص شرکت کی۔

کا چارج سنبھالا تو میڈم شہناز کا ٹائٹل مل گیا۔

س:۔ ادبی سفر کا آغاز کب ہوا؟

ج:۔ ویسے تو سکول کالج کے زمانے میں کچھ نہ کچھ لکھتی رہی۔
شادی کے بعد کئی سال سلسلہ منقطع رہا اور باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز 1988ء سے ہوا اور اس وقت بفضل تعالیٰ میری آٹھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں چار شعری مجموعے اور چار تحقیقی موضوعات پر کتب ہیں۔

س:۔ شاعری میں خاص کر غزل میں ہر شعر ایک افسانہ بیان کرتا ہے۔ آپ نے افسانے کیوں نہ لکھے؟

ج:۔ سکول کالج کے زمانے میں Short stories وغیرہ لکھیں۔ آپ نے درست کہا کہ غزل وہ پیرایہ اظہار ہے جس میں ایک شعر مکمل افسانہ ہوتا ہے۔ غزل آمد ہے افسانہ آورد۔ آمد پر کام کرنا آسان ہے کیونکہ شعر یا مصرعے الفاظ کا جامہ پہنے خود بخود اترتے چلے آتے ہیں جبکہ افسانے کیلئے مصنوعی طور پر ڈیسک ورک کرنا پڑتا ہے۔ ویسے اب میں نے دوبارہ مختصر کہانیاں لکھنا شروع کی ہیں۔

## غزل

میں کھو گئی ہوں مگر اب گمان بولے گا
کمیں بغیر یہ خالی مکان بولے گا
فصیل جسم کی اس قید سے رہا ہو کر
حصار روح میں باقی گیان بولے گا
زمانے بھر کی سمیٹی تیرگی شب نے
ملے گی جب بھی زباں آسمان بولے گا
چراغ جل ہے فروزاں ہتھیلیوں پہ میری
ہوا کا جھونکا میرے داستاں بولے گا
نقوش رسم وفا ثبت کر دیئے شہناز
مری صدا پہ یہ سارا جہان بولے گا

بشکریہ:۔ روزنامہ خبریں لاہور

خواب پورے نہیں ہوتے تخلیق کا ذہن مسلسل تخلیق کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ اس لئے یہ بتانا تو ناممکن ہے کہ کتنی شاعری باقی ہے کیونکہ ابھی تو فصیل جسم و جاں کے راز ہی سمجھ میں نہیں آئے۔ دشت نامعلوم کا یہ سفر جاری ہے اور جب تک یہ سفر جاری ہے شاعری بھی جاری رہے گی۔

س:۔ کیا آپ صرف اردو زبان میں شاعری کرتی ہیں یا اور زبانوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے؟

ج:۔ پاکستان میں بولی جانے والی سب زبانیں میری اپنی ہیں۔ اردو' پنجابی' سرائیکی میں شاعری کی ہے۔ میری پہلی نظم جو میں نے چوتھی جماعت میں کہی انگریزی میں تھی۔ اس کے علاوہ میرے مجموعوں میں ہندی کی غزلیں بھی شامل ہیں۔

س:۔ آپ نے دوسرے ممالک کا بھی سفر کیا۔ وہاں کسی شاعر یا ادیب سے ملنے کا اتفاق ہوا؟

ج:۔ جی' میں 1992ء میں ایک کورس کے لئے ہالینڈ گئی تھی۔ کورس کے دوران تو بے پناہ مصروفیت رہی' ہالینڈ میں اسد مفتی صاحب سے فون پر بات ہوتی رہی۔ تقریب کا اہتمام پروگرام میں ٹکراؤ کی بنا پر نہیں ہو سکا۔ بیلجیم میں پاکستانی کمیونٹی کے لوگوں نے ایک شام میرے ساتھ منائی۔ مقصود الٰہی شیخ صاحب نے بطور خاص انگلینڈ آنے کی دعوت دی۔ آپ ہفت روزہ راوی کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے بہت عزت افزائی فرمائی۔ برمنگھم میں ۲۲ اکتوبر کو ہونے والے ایک نعتیہ مشاعرہ میں شرکت کی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پاکستان میں ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ ۲۴ اکتوبر کو فریدہ بھابی اور شیخ صاحب نے میرے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا اس میں بہت سے شعرا سے ملاقات ہوئی۔ ان کا کلام سنا۔

س:۔ آج کل ایوارڈوں کا بہت تذکرہ چل رہا ہے۔ کبھی ایوارڈ حاصل کرنے کا خیال آیا؟

ج:۔ ایوارڈ حاصل کرنے کا خیال ایوارڈ حاصل کرنے والے کو نہیں آتا بلکہ ایوارڈ دینے والے کو آتا ہے۔ بفضل تعالیٰ مجھے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ جن میں تمغہ حسن کارکردگی 1989ء' ایوارڈ حسن کارکردگی 1991ء اور ایوارڈ برائے بہترین شاعرہ 1991ء شامل ہیں۔

س:۔ کچھ لوگ آپ کو شہناز مزمل کچھ شہناز سلطان اور کچھ میڈم شہناز مزمل کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟

ج:۔ شہناز مزمل تو تھی اور ہوں۔ شادی کے بعد شہناز سلطان ہو گئی۔ کم عمری میں شادی کی وجہ سے تعلیم نامکمل رہ گئی اور بچوں کو سکول بھیج کر جب میں دوبارہ طفل مکتب ہوئی تو اس جھنجھٹ سے بچنے کے لئے کون پرانے سرٹیفکیٹس میں نام بدلوائے۔ شہناز مزمل کے نام سے ہی دوبارہ تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ 1984ء میں ایم اے کیا پھر بطور اسسٹنٹ چیف لائبریرین ماڈل ٹاؤن لائبریری

# روزنامہ خبریں

## انٹرویو = سرفراز سید

ڈاکٹر شہناز مزمل ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور کی چیف لائبریرین ہیں۔ 1984ء میں پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس میں ایم اے اور پھر ہومیوپیتھی میں ڈاکٹریٹ کی۔ اردو' پنجابی' سرائیکی اور انگریزی میں شاعری کی ہے۔ فرانسیسی لکھ اور بول سکتی ہیں۔ دو ادبی انجمنوں کی صدر و سرپرست ہیں۔ بہت سے مضامین لکھ چکی اور لیکچر دے چکی ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں ان میں پیام نو' جرات اظہار' جذب و حروف' عکس دیوار پہ تصویر اور موم کا سائبان شامل ہیں۔ چھٹا مجموعہ میرا خواب ادھورا ہے زیر طبع ہے۔ پاکستان کے علاوہ بیلجیم' انگلستان اور دوسرے ممالک کے مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔ ان سے کچھ باتیں۔

س:۔ آپ کا لائبریری سے رشتہ بہت پرانا ہے کبھی محسوس ہوا۔ کتابیں آپ سے باتیں کر رہی ہیں؟

ج:۔ لائبریری سے وابستگی تو بچپن سے ہی ہے لیکن بطور پروفیشن 1984ء میں لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر اس کو اپنایا۔ کتابوں کے درمیان آنکھ کھولی۔ اوڑھنا بچھونا کتابیں ہی رہیں۔ کتابوں سے باتیں کرتے کرتے کتابیں مرتب کرنا آگیا۔ بہت کچھ کتابوں سے سنا سمجھا اور سیکھا اور اب ادب کے فروغ کے لئے کوشاں ہوں۔ کچھ نہ کچھ تخلیق کرتی رہتی ہوں اور کتابوں سے حاصل کردہ علم کتابوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا چاہتی ہوں۔

س:۔ آپ کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے' چھٹا تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ ابھی کتنی شاعری باقی ہے؟

ج:۔ جی میرا چھٹا شعری مجموعہ جلد منظر عام پر آجائے گا۔ جوں جوں مشاہدات بڑھتے جاتے ہیں۔ ذہنی افق کشادہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اور ادیب کی چشم بینا اور حساس دل بہت کچھ اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ افکار' خیالات اور الفاظ کا سمندر ذہن میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ ایک لاوا سا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور جب تپش بے حد بڑھ جاتی ہے اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو جذبے حرف بن کر جذب و حرف کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جب جرات اظہار کا قرینہ بھی آجاتا ہے تو کبھی "عکس دیوار پر تصویر" بن جاتی ہے اور کبھی موم کے سائبان۔ لیکن ادھورے

شہناز = دنیا قدیم ہے۔ لیکن اس کا نیا پن کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح روایت قدیم ہے۔ لیکن مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ شاعری میں روایتی رنگ نہ ہو تو شاعری نہیں رہتی۔ جذبے کبھی بھی قدیم اور فرسودہ نہیں ہوتے۔ ہم اپنے اوپر جدیدیت کا لبادہ ضرور اوڑھ لیتے ہیں۔ لیکن اصل میں اندر سے ہر ایک اپنی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ خوشبو قدیم ہو یا جدید خوشبو ہی رہتی ہے اور اپنا پتہ خود دیتی ہے۔

میں کھو گئی ہوں مگر اب کمان بولے گا
مکیں بغیر یہ خالی مکان بولے گا

زمانے بھر کی سمیٹی ہے تیرگی شب نے
ملے گی جب زباں آسمان بولے گا

دم رخصت اسے جینے کی دعا دی ہم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلا دی ہم نے
مل ہی جائے کسی تعبیر کو شاید اک خواب
عکس دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے

خوشبو ہو تم فضا میں بکھر کے دیکھنا
ہمراہ موسموں کے سنور سے تو دیکھنا
کیا کچھ چھپا ہوا ہے خلائے بسیط میں
اس کرب آگہی سے گزر کے تو دیکھنا

شکریہ:- روزنامہ پاکستان لاہور

شہناز = شاید کوئی ایسی کتاب نہیں۔

عورتوں کی کتابیں کم شائع ہوتی ہیں؟

ہمارے معاشرے میں ابھی تک مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک فاصلہ قائم ہے گو بظاہر یہ فرق کم ہوتا نظر آتا ہے۔ خواتین جس میدان میں کام کر رہی ہیں وہ اس میں کافی آگے ہیں اور مردوں سے کسی بھی طور پیچھے نہیں۔ مرد حضرات سے معذرت کے ساتھ کہ ہمارے مرد ابھی تک عورت کی برتری کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ سکول کالجوں کی سطح پر طالبات کی طرف سے بہت اچھا نمونہ سامنے آتا ہے مگر بعد میں وہ نام کہیں گم ہو جاتے ہیں۔

سنا ہے کہ کئی افسران کتابیں لے جاتے ہیں اور واپس نہیں کرتے۔

شہناز = اللہ کا شکر ہے کہ ہماری لائبریری کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہوتا۔ میں نے کچھ اصول بنائے ہیں اور اس پر سختی سے کاربند ہوں۔ بغیر ممبر شپ کے کسی کو بھی کتاب ایشو نہیں کی جاتی اس لئے اس کام کا آغاز بھی میں نے اپنے گھر سے کیا ہے۔ میرے شوہر اور بچیاں باقاعدہ ممبر ہیں اور ان کو بھی کتابیں دوسروں کی طرح ایشو کی جاتی ہیں۔

آپ کی پرسکون گھریلو زندگی کا راز کیا ہے؟

شہناز = اس میں میرے ساتھی کا بہت بڑا ہاتھ ہے کہ انہوں نے مجھے ایک پرسکون گھر اور پرسکون ماحول عطا کیا ہے اور ذہنی آزادی' سرچ کی آزادی اور ذہنی تسکین کے لئے ادب تخلیق کرنے کے لئے بہت اچھا ماحول بنا کر دیا ہے۔ یہ بات بتاتی چلوں کہ اپنی تمام تعلیم شادی کے بعد بچوں اور مشترکہ فیملی میں رہ کر مکمل کی ہے اور باقاعدہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں میں طلباء کی طرح بھرپور حصہ لیا ہے۔ بیرون ملک بھی تعلیم کے لئے جانے کا موقع ملا ہے۔ میں نے اپنے وقت کو بہت مثبت اور تعمیری انداز میں صرف کیا ہے اور یہ سب کچھ شوہر کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا۔

آپ کی پسندیدہ چیز کیا ہے؟

شہناز = میرا گھر جس میں میرے والدین' بہن بھائی میرے شوہر اور بچے شامل ہیں۔

اکثر لائبریرین ایسے ہیں جنہوں نے ایک کتاب بھی نہیں پڑھی ہوتی؟

شہناز = اب صورت حال تبدیل ہو رہی ہے۔ معاشرے میں مطالعہ کا شعور بڑھتا جا رہا ہے اور آج کا لائبریرین باقاعدہ ماسٹرز ڈگری ہولڈر ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پڑھنے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔

آپ کی شاعری کا رنگ روایتی ہے نئے زمانے میں مدہم خوشبو کہاں ہے؟

(انگلینڈ) اور برمنگھم میں بھی مشاعروں میں حصہ لینے کا موقع ملا ہے۔

س:۔ کیا آپ اپنی لائبریری میں بھی ادبی سرگرمیاں جاری رکھتی ہیں؟

ج:۔ ہاں۔ ہماری لائبریری میں اکثر تقریری مقابلے، سیمینار، لیکچرز، مشاعرے، ٹیلنٹ شو، طلباء و طالبات اور بچوں کی تقریبات اکثر منعقد ہوتی رہتی ہیں۔

س:۔ اپنی تصانیف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج:۔ اب تک میری آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "پیام نو۔ جرات اظہار۔ جذب و حروف۔ عکس دیوار پہ تصویر" شائع ہو چکی ہیں اور "میرا خواب ادھورا ہے" زیر طبع ہے۔

لائبریری سائنس کے بارے میں درج ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

"لائبریریوں کا شہر لاہور" "فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار۔ "کتابیات اقبال" "کتابیات مقالہ جات"۔

اس کے علاوہ میری تخلیقات "تجدید نو" "اخبار خواتین" "اخبار جہاں" "تخلیق نیرنگ خیال اور لطیف ویمن ٹائمز پاکیزہ وغیرہ اور دوسرے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ہفت روزہ "راوی" بریڈ فورڈ انگلینڈ میں بھی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔

س:۔ اپنے غیر ملکی دوروں کے بارے میں بتائیں؟

ج:۔ میں نے لائبریری سائنس کے سلسلے میں ہالینڈ کا دورہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ بیلجیئم لکسمبرگ انگلینڈ میں لندن، بریڈ فورڈ اور برمنگھم کا دورہ بھی کیا ہے۔ جہاں جناب مقصود الٰہی شیخ صاحب کی مہمان نوازی سے محظوظ ہوئی۔

س:۔ آپ کے پسندیدہ شاعر کون کون ہیں

ج:۔ کلاسک میں مرزا غالب اور ن م راشد اور شاعرات میں محترمہ ادا جعفری ہیں۔

س:۔ کیا آپ کسی ادبی تحریک سے وابستہ ہیں؟

ج:۔ نہیں۔

س:۔ موجودہ ادب کو آپ کس نگاہ سے دیکھتی ہیں؟

ج:۔ موجودہ ادیبوں میں اچھا ٹیلنٹ ہے اور موجودہ ادب میں کافی پیش رفت ہوئی اور ادیب کو معاشرے میں عزت کا مقام ملنا چاہئے۔ ایک نئی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ سکوت ٹوٹنے کا امکان پیدا ہو۔ مگر اس کے لئے لوگوں کے ذہنی رجحان کو بدلنا پڑے گا۔

س:۔ کیا آپ معاشرے میں عورت کے مقام سے مطمئن ہیں؟

ج:۔ ایک حد تک ہوں کہ کم از کم ذہنی آزادی ہے۔ لیکن کم تعلیم یافتہ اور کم تہذیب یافتہ مردوں کو برتری کا احساس رہتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کا باہمی توازن اور باہمی تہذیبی سلوک ہی

معاشرے کو ترقی دے سکتا ہے۔

س:- روپے بٹتے ہیں ماحول ان کو بنانے کا ذمہ دار ی ہوتا ہے وی سی آر اور وڈیو نے ہمارے معاشرے پر برے اثرات چھوڑے ہیں۔

ج:- وڈیو فلمیں چاہے بھارتی ہوں یا مغربی' نوجوان نسل پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ نوجوانوں میں مطالعے کا شوق اجاگر کرنا چاہئے۔ لائبریریوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ ہر کونسلر کے وارڈ میں ایک پبلک لائبریری ہو اور ہر گھر میں ایک پرائیویٹ لائبریری ہو۔ اور صحیح کتابوں کے مطالعہ سے نوجوانوں کی تخریبی سوچ' تعمیری سوچ میں بدل جائے۔ ہالینڈ میں لائبریریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ سکولوں' کالجوں کی مدد کے لئے برانچ لائبریریاں ہیں۔ ہمارے ہاں بھی لائبریریوں کا ایک نظام ہونا چاہئے۔

س:- ادب اور لائبریری کے علاوہ آپ کے اور کون سے مشاغل ہیں؟

ج:- میرا سب سے بڑا شغل لکھنا لکھانا ہے۔ کبھی کبھی بیڈمنٹن کھیلتی ہوں۔

س:- آپ سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ آپ نے بہت کچھ بتایا لیکن شاعری کے معاملے میں آپ بخل سے کام لے رہی ہیں۔ کچھ اپنے نئے دیوان اور شاعری کے بارے میں بتائیں۔

ج:- بات دراصل یہ ہے کہ میرا ایک مشاعرے کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا۔ بدقسمتی سے میری بیاض وہاں گم ہو گئی۔ جو آج تک نہیں مل سکی۔ اگر وہ گم نہ ہوئی ہوتی تو میرا مجموعہ کلام "موم کے سائبان" کب کا چھپ چکا ہوتا۔ اب بھی انشاء اللہ اسی ماہ یہ مجموعہ آ رہا ہے۔ رہی شاعری کی بات تو کچھ تازہ اشعار حاضر ہیں۔

میری آنکھیں سمندر ہو گئی ہیں
میں سورج بن کے جلتی جا رہی ہوں

پہچاننے کا خود کو بہت اشتیاق ہے
اپنے لئے کہیں پہ رخ آئینہ بھی ہو

کوئی کسی سے میرا اضطراب لے جائے
سمیٹ کر مرے سارے عذاب لے جائے

مجھ کو عادت نہیں ہے دستک کی
خود کوئی در کھلا تو کیا ہو گا

جو ہو سکے تو پلٹ کر کبھی چلے آنا
شب فراق میں دستک نہ تم دیا کرتا

جاگتی آنکھوں میں اک شہر تمنا آباد
خواب سب چھین لئے تعبیر نہیں بنتی ہے

کیوں آج تیرا سفر کم نہیں ہوتا
ہر موسم گل عشق کا موسم نہیں ہوتا

چشم تر میری پتھرا گئی تو کیا ہو گا
یقین کی آخری حد آئی تو کیا ہو گا

حقیقت میں شہناز جتنی بڑی افسر اور شاعرہ ہیں اتنی بڑی انسان بھی ہیں۔ ان کے سینے میں ایک حساس دل دھڑکتا ہے۔ وہ جو سوچتی ہیں وہ لکھتی ہیں ان کی شاعری ہی ان کی پہچان ہے۔ وہ زبردستی کر آگے بڑھنے اور شہرت حاصل کرنے کی قائل نہیں ہیں۔ شہناز مزمل اگر اسی لگن اور محنت سے شاعری کرتی رہیں تو ایک دن پاکستان کی صف اول کی شاعرات میں ان کا شمار ہو گا۔

بشکریہ:۔ ماہنامہ ویمن ٹائمز لاہور

Grams : KRLABS

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Phone : 843397



GOVERNMENT OF PAKISTAN

DR. A. Q. KHAN RESEARCH LABORATORIES KAHUTA

P O BOX NO 502 RAWALPINDI (PAKISTAN)

DR. A. Q. KHAN
Hilal-i-Imtiaz
Fellow Pakistan Academy of Sciences
Director Project

محترمہ شہناز مزمل صاحبہ،

السلام علیکم۔

آپ کا عطا کردہ تحفہ عکسِ دلدار بدست ضمیر ملک صاحب کی معرفت موصول ہوا۔ آپ کی عنایت کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت صلاحیت دی ہے۔ ویسے تو تمام مجموعہ ہی ماشاء اللہ بہت خوبصورت اور پرکشش ہے لیکن چند ایک دو اشعار دل پر اثر کر گئے ہیں۔ ایک

ہر جگہ پر تمام ہو کے بھی
درد اب اختیار سے باہر ہے۔

اور دوسرا

شہناز ہم نے ایسے گزارا ہے زندگی
دنیا میں جیسے کوئی ہمارا خدا نہ تھا

اللہ تعالیٰ آپ کو مزید قوتِ قلم عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط۔

والسلام۔ آپ کا خیر اندیش۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

# پروفیسر شمیم یوسف

اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ لاہور


پیاری شہناز مزمل

خوش رہو!

السلام علیکم! امید ہے کہ تم بخیریت ہو گی بہت ہی عرصہ بعد تم سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ لیکن یقین جانو یہ احساس ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہا کہ تمہاری مقروض ہوں مگر یہ قرض داد ہنر کا نہیں بلکہ اعتراف کمال کا ہے۔

عکس دیوار پہ تصویر بنے دیکھی۔ عنوان میں تجربیت کا احساس ہوا۔ ساحل شوق پر خیمے کی طناب ہے ایک جفاکش اپنے آلات کے ساتھ بھور سا اور اس پر طرہ شفق کا لال پیلا غازہ تصویر کے ایک رخ پر جلوہ افروز تھا۔ خاور شام تصویر پر بنے پیکر کے پیچھے کہیں گم تھا۔ شاید مقصود اس کا یہ ہے کہ جمال اجاگر ہو اور جلال پس پردہ رہے۔

میں نہ تو ادب کے اساتذہ میں سے ہوں اور نہ ہی اس کے تلامذہ میں سے۔ لیکن آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے' کے مترادف تمہاری کتاب کی جو خوشبو میں نے محسوس کی ہے اس کی لطافت کا اظہار ان چند الفاظ میں کرنے کی سعی کرتی ہوں۔

کتاب کے دوسرے رخ پر لکھے شہزاد احمد کے الفاظ زیادہ پسند آئے اور جب اس کتاب کے جذب و حروف ملاحظہ کئے تو ان الفاظ پر یقین سا آگیا کہ تم نے زندگی اور کتاب دونوں کے ساتھ ساتھ اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔

کتاب کھولتی ہوں تو کہیں خوش آئند لمحوں کی تلاش نظر آتی ہے اور کہیں سرحد امکاں کی دوری کا شکوہ نظر آتا ہے۔

مجھے ہے سوچوں کے پار جانا.....\
میں خود ہی خود میں سمٹ رہی ہوں\
میں آگے جاؤں یا لوٹ آؤں\
مگر پھر جلد ہی

ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کے لئے\
ریت کے گھر پہ بھی دیوار اٹھا دی ہم نے!

کے مصداق "شام مقدر پہ سحر" پھوٹنے لگی اور حاصل عزم یہ ہوا کہ

میں دست امکاں بڑھا رہی ہوں!
یہ سفر امکاں ہے لا مکاں تک!

ہاں۔ ہاں! جو بڑے ذہن ہوتے ہیں وہ تشنہ منزل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ہر گام ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا سفر کبھی رکتا نہیں۔ شاید ایسا ہی پیکر ہے جس کے بارے میں تم نے کہا ہے کہ

دائرہ اپنا مکمل کر کے آہستہ سے پھر
کنج ہستی سے نکل جانا اسے اچھا لگا!

لیکن شک ہوتا ہے کہ اس شعر میں شکوہ زیادہ ہے اور گامزن رہنے کی توجیہہ کم۔ بہرحال شعر بھی تصویر جیسے ہوتے ہیں..... ایک رخ ایک پہلو عیاں کرتا ہے اور دوسرا کئی مزید!

تمہارے "ذوق مسافت" سے ہٹ کر دیکھوں کہ جس میں.......

رستہ خود سر ایسا ٹھہرا
منزل سے بھی آگے جائے!

تو رین بسیرے نظر آتے ہیں کہ جن میں "آسوں کے کچھ دیپ" جلے ہیں۔ "برہن من" میں آگ لگی ہے اور "تپسیا" عروج کے اس مقام کا دعویٰ رکھتی ہے کہ پردہ ہٹا کے رہا!

"آس کا جنگل" اس سے پہلے بھی تم نے دکھایا تھا۔ وہ جب "جذب و حروف" پہلی مرتبہ رونق قرطاس بنے تھے۔ ایک طویل، عجیب جنگل ہے یہ بھی! کہیں سنگ خشت کا شکوہ نہیں بلکہ پیا کی پیت کا قصہ ہے۔ خار و گلبن کے اندوہ کن فسانے نہیں بلکہ آس کی ایک مسلسل چھایا ہے جس کا سارے رستے پہ سایہ ہے۔ چند سطور اس نظم کی یعنی ۴۳ سے ۴۷ تک اپنی مثال آپ ہیں..... پھر تم اس کے جذبات کو بھی تو سمجھتی ہو۔

پھر بھی میں اعتبار کرتی ہوں
اور تیرا انتظار کرتی ہوں
جانتی ہوں کہ تو بھی میرے بغیر
کتنا تنہا سا لگ رہا ہو گا!
اور میری طرح تیرا بھی
دل وہاں پر نہ لگ رہا ہو گا!

اور پھر ایک میٹھی تڑپ.......

میرا موہوم تمناؤں سے دامن بھر کے
تو نے سمجھا کہ کھلونوں سے بہل جاؤں گی!

شہناز! تمہاری نظمیں "کن فکان" "ان کہی خواہش" "اصل کی تلاش" "لوح وجود" اور باقی سب تمہاری غزلوں کی طرح حسین ہیں۔ بلکہ مجھے کہنے دو کہ تمہاری طرح حسین ہیں۔ تم میں جرات اظہار بھی ہے اور سلیقہ گفتار بھی۔ تمہارے اندر ایک نغمہ سرا دل ہے، جو لفظوں میں ایک حسین لے اور موسیقیت بھر دیتا ہے اور ذات کے اندر ایک مصور بھی ہے جو کہ عکس دیوار پر تصویریں ابھارتا ہے۔

زمانہ یقیناً سخن شناس نہیں اور دریں حالات تمہارا یہ کہنا کہ

تلاش اہل نظر ہی مجھے کریں گے کبھی

ورق میں سادہ کسی آن کھلی کتاب میں ہوں

ایک حد تک صحیح ہے۔ تمہارے فن اور جذبوں کے اعتراف کا اظہار غالباً نہ کر پائی ہوں اس لئے معذرت چاہوں گی۔

اچھی خواہشات کے ساتھ

تمہاری دوست

پروفیسر شمیم یوسف

اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ لاہور



# "جراتِ اظہار"

طفیل ہوشیار پوری

پاکستان میں جہاں اردو ادب کی خدمت کئی سال بلند پایہ ممتاز اور کہنہ مشق شعراء اور ادبا کر رہے ہیں وہاں ادیب خواتین بھی اپنا رول بڑے سلیقے سے ادا کرنے میں کسی گروہ سے پیچھے نہیں ان میں شمیم ملیح آبادی، رابعہ نہاں، ادا جعفری، کشور ناہید، شبنم شکیل اور دوسری شاعرات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔

حضرت حشر القادری مرحوم کی صاحبزادی شہناز مزمل پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ اعلیٰ تعلیم کے مرحلے بڑی کامیابی سے طے کئے ان دنوں ایک عظیم کتاب خانہ گورنمنٹ ملٹی ٹاؤن لائبریری میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔

فن شاعری انہیں وراثت میں ملا ہے وہ دنیائے شعر و ادب میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ لے کے آ رہی ہیں۔

رسائل و جرائد میں چھپنے سے بے نیاز رہنے کی وجہ سے وہ عام ادبی حلقوں میں متعارف نہیں لیکن خواص ان کے فن اور فکر سے بخوبی آشنا ہیں۔

"جراتِ اظہار" ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کمیاب لمحوں کا حاصل ہے جو انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں سے کسی نہ کسی طرح حاصل کئے ان کی طبیعت کی سادگی، شرافت اور خلوص کسی کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا دھیما لہجہ ہمدردانہ رویہ سب کے لئے باعث کشش ہے وہ ایک شریف الطبع عبادت گزار خاتون ہیں۔ انہیں ہم جدید خواتین میں بھی شامل کر سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ مسلمان خاتون ہیں جنہیں بچوں کی تربیت اور خاوند کی خدمت عبادت نظر آتی ہے۔ شہناز مزمل کی شاعری غزل اور نظم دونوں پر محیط ہے اعلیٰ انسانی قدریں جنہیں ہم بجا طور پر اسلامی اور آفاقی اقدار کا نام دے سکتے ہیں ان کی شاعری میں جا بجا موجود ہیں۔

شہناز مزمل کی غزل میں پاکیزگی فکر اور دلنواز پیرایہ بیان بیک وقت موجود ہے وہ اپنی

میں ہوں خاموش یہ اک راز نہاں ہے شہناز
یہ غلط ہے کہ نہیں جرأت اظہار مجھے

---

داستان غم دل کا ہے جو آنسو محرم
میں نے وہ اشک بھی پلکوں میں چھپا رکھا ہے

---

حیران ہوں کہ جذبہ وحدت کو بھول کر
کیوں فرقہ بندیوں میں مسلمان بٹ گئے

---

میرے سجدوں کے مقدر میں وہ سنگ در نہ تھا
میری پیشانی پہ داغ نا رسائی دیکھئے

---

کمزوروں کا احساس غریبوں کی محبت
اسلام کی نظروں میں ہے یہ ایک عبادت
اس جذبے کا کس لئے دل میں تیرے فقدان
اسلام کا بندہ ہے تو اسلام کو پہچان

---

فریب کھائے ہیں دنیا میں اس قدر میں نے
ترا تو کیا مجھے اپنا بھی اعتبار نہیں

---

مقام زندگی ملتا ہے ان کو بام رفعت پر
ودیعت جن کو فطرت سے طبیعت عاجزانہ ہے

میں ہوں خاموش یہ اک راز نہاں ہے شہناز
یہ غلط ہے کہ نہیں جراتِ اظہار مجھے

---

داستاں غم دل کا ہے جو آنسو محرم
میں نے وہ اشک بھی پلکوں میں چھپا رکھا ہے

---

حیران ہوں کہ جذبہ وحدت کو بھول کر
کیوں فرقہ بندیوں میں مسلمان بٹ گیا

---

میرے سجدوں کے مقدر میں وہ سنگ در نہ تھا
میری پیشانی پہ داغ نا رسائی دیکھئے

---

کمزوروں کا احساس غریبوں کی محبت
اسلام کی نظروں میں ہے یہ ایک عبادت
اس جذبے کا کس لئے دل میں تیرے فقدان
اسلام کا بندہ ہے تو اسلام کو پہچان

---

فریب کھائے ہیں دنیا میں اس قدر میں نے
ترا تو کیا مجھے اپنا بھی اعتبار نہیں

---

مقام زندگی ملتا ہے ان کو بام رفعت پہ
ودیعت جن کو فطرت سے طبیعت عاجزانہ ہے

زمانہ ایک طرف ہے تو اک طرف دل ہے
مرے لئے بڑا مشکل ہے فیصلہ یا رب!

---

ذرے کی آفتاب میں دیکھے گا جھلکیاں
پردہ تری نگاہ سے جس وقت ہٹ گیا

---

اللہ سے کسی کو محبت نہیں رہی
دولت سے ہو گئی ہے عقیدت نہ پوچھئے

جرات اظہار میں اس قبیل کے لاتعداد اشعار اور بھی موجود ہیں ---- ماشااللہ



# سرسری بیان

شہناز مزمل ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں کتاب جن کی زندگی ہے وہ مقدس ترین پیشوں میں سے ایک اہم پیشے سے وابستہ ہیں - ظاہر ہے نفاست ان کے مزاج میں رچی بسی ہے وہ ایک مہذب ، اور شائستہ خاتون ہیں - ان صفات کے حامل انسان کو ادب دوست تو ہونا ہی چاہئے ---- مگر تخلیق ادب خصوصاً شاعری ایک ایسی نعمت ہے جو انسان کو عطا ہوتی ہے اکتسابی نہیں ہوتی - شہناز شاعر ہیں ماحول ان کا کتاب - مزاج ان کا نفیس ، شاعری ان کی فطری ، اردو ان کی اپنی زبان ---- ان سب باتوں نے انہیں ایک ایسی شاعر بنا دیا ہے کہ ان سے خوش گوار توقع وابستہ کی جا سکتی ہے اگر وہ ذمے داری اور ذوق و شوق سے گہری توجہ دینے کا ارادہ یا عزم کر لیں ---- شاعری سپردگی کا مطالعہ کرتی ہے -

ان کی شاعری اپنی معاصر شاعرات سے بہت حد تک مختلف ہے ان کے موضوعات عام طور پر قومی ، ملی ، اور اصلاحی ہیں انہوں نے اپنا قاری بچوں کے طبقے کو بنایا ہے مگر انہیں بچوں کا شاعر نہیں کہا جا سکتا وہ بچوں کے ساتھ کھیلتی نہیں - انہیں گدگدانے کی کوشش نہیں کرتیں جیسے عام طور سے بچوں کے شاعر کرتے ہیں ---- وہ ایک ماں ہیں ---- اور ماں کی حیثیت میں تربیت کرنے کی کوشش کرتی ہیں - ان کے موضوع اخلاقیات پاکستان اور اسلام سے زیادہ متعلق ہیں - اپنے پسندیدہ موضوعات کے لئے نہایت مناسب اور متوازن زبان استعمال کرتی ہیں ان کے بیان میں سادگی اور پرکاری نیز تاثیر بدرجہ اتم محسوس ہوتی ہے وہ عام طور سے نظم کی ہیئت استعمال کرتی ہیں اور یہی ان کے موضوعات کا تقاضا ہے -

غزل شاید انہوں نے بہت کم کہی ہے کم سے کم اس مجموعے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جو چند غزلیں شامل کی ہیں وہ گواہی دیتی ہیں کہ انہیں ہمہ وقت طور مشفق ہی کا کردار ادا نہیں کرنا چاہیے - اس سرحد سے باہر بھی نکلنا چاہیے حسن و عشق کے تذکرے کے بغیر نہ زندگی مکمل ہوتی ہے نہ شاعری اپنے جوہر دکھاتی ہے ---- کچھ ایسی ہی صورت حال غزل کی ہے - غزل کے بغیر اردو شاعری کا کوئی مجموعہ بڑی مشکل سے اعتبار حاصل کر سکتا ہے - قصہ مختصر اگر وہ اپنے آپ کو گوشہ گیری سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو ایک کامیاب شاعر تسلیم کی جا سکتی ہیں -

شہرت بخاری

ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی

لاہور ---- ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۰ء

شہزاد احمد

شہناز مزمل نے زندگی اور کتاب دونوں کے ساتھ اپنا قائم رکھا ہے اس کا عملی ثبوت ان کی شاعری بھی ہے ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے مسائل سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے جذباتی سطح پر یہ شاعری معصوم اور خاموش جذبوں کا اظہار ہے انہوں نے دھیمے دھیمے لفظوں میں اپنے دل کی بات کہی ہے اور بھی بانہ آہنگ وعدے سنیں گئے۔ یہی مدھم مدھم لہجہ ان کا اسلوب خاص ہے۔

سعد اللہ شاہ

شہناز کی دنیا نے تخیل میں جنم لینے والے سچے جذبے ان ثمر بار شاخوں کی مانند ہیں جن کے نم دیدہ پتے بھٹکے ہوئے راہی کے قرطاس جمال پر شبنمی لمس رکھ دیں۔ شہناز کی شاعری خشبودار دھوپ کی طرح ہے۔ اس کی ہتھیلی پر ایک خوبصورت آشیانہ ہے۔ جس میں رہنے والی چڑیوں کے بال و پر نکل آنے ہیں۔ پو پھٹنے کے ساتھ پرندوں کا گیت اسے نادیدہ جہان کا دھیان بخشتا ہے۔

شہناز نے خیال پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اس کے ہاں غزل اور نظم دونوں میں اس کے معصوم جذبوں کا عکس موجود ہے۔ وہ قرض وفا، اس کی شاعری سے ایک جھلک ہے۔

وہ مری زیست کا پیمبر تھا
لوگ کہتے ہیں وہ ستمگر تھا

وہ جو جھکتا تو کس طرح جھکتا
اس کے آگے انا کا پتھر تھا

میں نے پتھر پہ پھوڑ ڈالا سر
ایک قرضِ وفا مرے سر تھا

# ایک دانشور مجاہدہ۔ شہناز مزمل

منصور آفاق

مجھے بہادروں کی تلواروں کی قسم کہ شہناز مزمل کے ہاتھ میں وہی قلم ہے جس کی سوگند رب ذوالجلال نے کھائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

"قسم ہے قلم کی اور قلم سے لکھے ہوئے کی"

یہی قلم نیکیوں کی پر سعادت صبحوں کا افتتاح بھی ہو سکتا ہے اور تیرہ و تار گناہوں کی منجمد رات بھی جو سینکڑوں دوسری راتوں سے جوڑ دی گئی ہے۔

خیر کے لفظ کا اجر ثمر آور پیڑوں کی طرح ہوتا ہے جو صدیوں تک نسل انسانی کو اپنی چھاؤں اور اپنے ثمر سے سرفراز کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح شر کی خاطر لکھی جانے والی تحریر بھی جب تک بدی کی قوتوں کی ترویج کرتی رہتی ہیں اس کے خالق کی لوح تقدیر لازوال گناہوں کے دھبوں سے داغدار ہوتی ہے۔

شہناز مزمل اس حوالے سے ایک خوش بخت شاعرہ ہے کہ اس کے لفظ مشرقی اقدار کے پاسدار ہیں۔ اس کی فکر پاکیزگی اور طہارت کی امین ہے اس نے دین اور وطن کی محبت کو تخلیقی عمل میں بدل دیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خطہ عشق محمد یعنی پاکستان سے گہری وابستگی نے ان کی شعری فضا کو تقدس مآب نغموں سے معمور کر دیا ہے۔ یوں اردو ادب دانش گاہ محمد سے تربیت حاصل کر کے ادب عالیہ کی آبرو بن رہا ہے۔

شہناز مزمل نے نہ صرف عورت کے وقار اور شرم و حیا کا بھرم رکھا ہے بلکہ عظیم مقاصد کی طرف پیش رفت بھی کی ہے۔ عورت کو خواب گاہ اور باورچی خانے سے نکال کر یہ احساس دلایا ہے کہ وہ ایک بڑی کائنات میں مقیم ہے اور اسے تسخیر کر سکتی ہے لیکن اس کی تسخیر کا رستہ فاطمۃ الزہرہ کا رستہ ہے۔ رابعہ بصری کا رستہ ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ عورت ملی غیرت اور دینی حمیت کو چھوڑ کر صباح کی پری بن جائے۔

اس نے نہ صرف شاعری میں عورت کو عالمگیر غلبہ اسلام، انسانیت اور مساوات کی سربلندی، شعور ذات، شخصیت اور کردار کی تعمیر اور تصوف جیسے صوفیانہ اور دانشورانہ مسائل پر سوچنے کی دعوت دی ہے وہ تو کہتی ہے کہ سنگینی حالات کا اب یہ تقاضا ہے کہ ہتھیلیوں پر سروں کو سجا کر سرمیدان نکل آئیں تاکہ ظلمت شب کا دامن چاک کر کے ایمان کا آفتاب طلوع کیا جا سکے۔ وہ عورت کو ایک دانشور مجاہدہ کے روپ سروپ میں دیکھنا چاہتی ہے اور ایسی شاعرہ کی موجودہ ادب میں کوئی مثال نہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ انہیں تو ایسی شاعرات چاہئیں جو مغرب کی تقلید میں ان کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں اور اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ آخر ان کی تمام تنقید مغربی ادب سے بر آمد شدہ ہے۔

شہناز مزمل ایک باطنی تبدیلی کی خواہش مند شاعرہ ہے۔ وہ زمین کی پستیوں سے تنگ آچکی ہے اس لئے اپنے رابطے اولاک کی وسعتوں سے رکھنا چاہتی ہے۔ خالق کائنات کی بارگاہ میں اپنے لئے جگہ مانگتی ہے۔ اسے علم ہے اگر اس بارگاہ میں سے امان مل گئی تو پھر وہ اپنے آپ سے آشنا ہو جائے گی۔ اس پر تمام جہانوں کے راز فاش ہو جائیں گے۔ پھر اسے یقین کامل ہو جائے گا کہ میں ہی عالم لاہوت کی خوش بخت سحر ہوں۔ میں ہی حرکت افلاک ہوں اور میں ہی ثابت و سیار۔ وہ جذب و مستی کی بقاء سے شناسا۔ اسے معلوم ہے کہ عشق کی فضا کوئی نہیں۔ وہ فلسفہ جذب و فنا کے عمل سے واقف ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جذب کے بغیر کوئی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی اور شاید اسی کیفیت میں اس نے اپنے آپ کو بھلا رکھا ہے اور شاید اسی لئے اس نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام بھی "جذب و حروف" رکھا ہے اور وہ اپنے تمام گم شدہ جذب و حروف کی تلاش میں تحقیق کے دروازوں پر مسلسل دستک دیتی چلی آرہی ہے۔

اردو ادب میں کوئی بھی بڑی شاعرہ موجود نہیں بلکہ یونانی زبان کی شاعرہ سیفو کے سوا دنیا کی کسی زبان میں کوئی عورت بڑی شاعری نہیں کر سکی۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی معاشرتی جبر ہے جس نے دنیا کے ہر خطے میں عورت کا استحصال کیا۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کی صدی ہے۔ اب توقع کی جا سکتی تھی کہ انگریزی زبان میں کوئی بڑی شاعرہ نمودار ہو مگر یورپ نے بھی آزادی نسواں کے نام پر عورت کو جنس کی دکان بنا دیا ہے اس لئے یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

عرب، ایران اور برصغیر میں عورت ابھی قدیم رسومات اور رواجوں میں قید ہے اس لئے اگر کوئی شاعرہ ذرا سی بھی نمایاں ہوتی ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ شہناز مزمل اس حوالے سے بھی قابل تحسین ہے کہ ایسے پابند معاشرہ میں بھی اپنی ذات کا اظہار کر رہی ہے۔ وگرنہ مشرق کی معاشرت تو عورت کو شاعری کا کیا، ہنسنے اور رونے کا حق بھی نہیں دیتی۔ اگر کسی آنکھ میں آنسو مچلنے ہی لگیں تو ہاتھ وہ آنکھ نکالنے کے لئے بڑھنے لگتے ہیں۔ اگر کسی لب پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھیں تو لوگ انہیں کاٹنے پر تل جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں جو شاعرہ بھی سامنے آئی ایک جھنجھلاہٹ کا شکار محسوس ہوئی اور زلف و گیسو کے علاوہ ان موضوعات سے دانستہ گریز پا رہی جو مردوں کے پسندیدہ تھے۔ مگر شہناز مزمل نے اپنے عہد کی شاعرات کے برعکس انہی موضوعات پر ہاتھ ڈالا۔ جنہیں مردوں نے اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔ تصوف اور روحانیت جیسے معاملات پر کھل کر اظہار خیال کیا لیکن کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ کسی خاتون کی شاعری نہیں بلکہ شہناز مزمل کی شخصیت، تو اپنی شاعری میں جاگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

دراصل شاعری کی تخلیق میں زیادہ عمل دخل تربیت اور مطالعے کا ہوتا ہے۔ آدمی جیسا مطالعہ کرتا ہے جس طرح کے لوگوں سے تربیت حاصل کرتا ہے وہ اس کے تخلیقی عمل پر بہت زیادہ اثرات مرتب کرتے ہیں۔ شہناز مزمل کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی تربیت گاہ کوئی نیکیوں سے بھرا ہوا آنگن بنا۔ جس میں پاکیزگی تھی اور منور باطنوں والے لوگ رہتے تھے۔ دوسرے اس کا مطالعہ بھی اس طرح کا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اقبال جیسا لاہوتی فضا رکھنے والا شاعر اس کے دل کے قریب آباد ہے۔

میری ان باتوں کا مفہوم قطعاً یہ نہیں کہ اس نے ان موضوعات کو چھیڑا ہی نہیں جو اس عہد سے وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ نہیں گئی بلکہ اس نے تو اس کی چھاؤں کو اپنا ہمسفر بنا لیا ہے۔ مجھے نئی راہوں پر روایت کا شجر سایہ دار اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور لمحہ موجود کے سلگتے ہوئے موضوع کینوس پر اس کے باطنی رنگوں میں کھل کر ایک نئی تصویر بناتے ہیں۔ ایک ایسی تصویر جس میں ہمارا ماضی بھی ہے حال بھی اور مستقبل بھی۔

شہناز مزمل نے اپنی بات کو استعاروں اور تشبیہوں کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا۔ وہ جانتی ہے کہ آج کے تیز رفتار دور کے پاس فرصت کی اتنی ساعتیں نہیں کہ وہ آپ کے شعر پر گھنٹوں سوچ سکے۔ اس کی تو کوشش ہوتی ہے کہ خیال لفظوں سے ابل رہا ہو۔ اپنی اسی کوشش میں وہ مکمل طور پر کامیاب دکھائی دیتی ہے۔

## فیصل حنیف

شاعری نامعلوم کا سفر ہے اور نامعلوم ہمارے تمام تصورات سے بڑا ہے اس کائنات کے ہر ذرے میں نامعلوم کا اک جہاں آباد ہے اس گمشدہ جہاں کی تلاش ہی شاعری ہے شعر لکھنے کی جستجو شاعر میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے منظروں میں چھپے پس منظروں اور پس منظروں کا ادراک ہو جاتا ہے۔

محترمہ شہناز مزمل کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ جیسے میں دشت حیرت میں سفر کر رہا ہوں اور اس کے ہر قدم پر ایک نئی حقیقت میری منتظر ہے یا پھر یوں ہے کہ پرانی حقیقتیں اپنے چہرے اور پیراہن بدل بدل کر میرے سامنے آ رہی ہیں ہمارے عہد میں خاص طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب شاعر کو اس قسم کی صورتحال کا سامنا ہو تو اس کے لئے شاعری کی مروجہ Diction بالعموم اور اس کی Form بالخصوص Out Of Date ہو جاتی ہے اس حوالے سے جب میں شہناز مزمل کی شاعری دیکھتا ہوں تو مجھے خوشگوار حیرت ہوتی ہے ان کے ہاں کلاسیکل غزل کا پورا رچاؤ موجود ہے۔ پرانے الفاظ کے Creative استعمال کے ساتھ ساتھ انہوں نے مستعمل الفاظ کو بھی خوبصورتی سے Poetify کیا ہے۔ جو ان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

# موم کے سائبان

معاشرے میں کوتاہیوں اور بگاڑ کا احساس۔ ایک بڑے آدرش اور اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستگی۔ مذہب اور وطن سے محبت۔ مثالی بود و باش کی خواہش' ایک نامہربان آس پاس میں ایک غمگسار اشارہ یہ ہے شہناز مزمل کی شاعری خوبصورت مستقبل کی آس کے ساتھ۔

منیر نیازی

"شہناز مزمل اردو شاعری میں جانا پہچانا نام ہے۔ پانچویں شعری مجموعہ کی اشاعت ان کے تخلیقی عمل کے اصرار کی شہادت ہے۔ فی زمانہ غیر رسمی شعری اسلوب میں شعر لکھنا ایک جہاد سے کم نہیں ہے۔ شہناز مزمل نے یہ جہاد اپنی نظموں میں کیا ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں ایک جذباتی روانی ہے جو ان کے اپنے موضوع سے قرب کا یقین دلاتی ہے۔ ان کی نظمیں خود آگہی کا سفر ہیں' وہ اپنی نظموں کے ذریعے اپنی محصور ذات کو دریافت کرتی ہیں' یہ دریافت رومانی اور مابعد از طبعیاتی نہیں' ارضی اور حقیقی ہے

شہناز مزمل کی نظمیں جو جذباتی سطح مرتب کرتی ہیں ان میں معاصر ناہموار زندگی کی رنگت اور فرد کی ازلی مجبوری کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔"

انیس ناگی

شہناز مزمل انتہائی حساس اور باشعور شاعرہ ہے۔ اس کا کلام ہجرو فراق کے درد و گداز اور تلاش و جستجو کے کرب مسلسل کا آئینہ دار ہے۔ شہناز مزمل دکھ کے انتہائی گہرے ہیں۔ اس کا اظہار خوبصورت اور دل نشیں ہے۔ اس کی غزلیں اور نظمیں دلوں کے دروازوں پر دستکیں دیتی محسوس ہوتی ہیں۔

شہناز مزمل کے کلام کا سب سے نمایاں وصف اظہار کی سچائی اور بے ساختہ پن ہے۔ وہ لفظی' بازیگری اور تکلفات کی قائل نہیں' اس کا کلام قاری کے دل و دماغ کو

مدتوں اپنے حلقہ اثر میں رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

روحی کنجاہی

شہناز مزمل کو میں نے مختلف مشاعروں میں سنا۔ یہ اندازہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ان اگنت شعراء شاعرات میں سے ہیں جو وقت گزاری کے لئے شاعری کرتے ہیں لیکن جب ان کا شعری مجموعہ میری نظر سے گزرا تو میں نے دو آراء قائم کیں ایک یہ کہ کسی شاعر کی دو چار "مشاعرتی" غزلیں سن کر اس کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے اور دوسرے رائے شہناز مزمل کے حوالے سے تھی جو میری پہلی رائے سے بالکل مختلف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شہناز کی شاعری وقت گزاری کے خیال سے کی گئی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ان کے پیچھے انسان کا وہ صدیوں پرانا دکھ ہے جو اپنی تمام سہولتوں اور راحتوں کے حصول کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ احساس ذات اور شکست ذات کی کہانی ہے جو گھوم پھر کر ایک ہی موڑ پر آن کھڑی ہوتی ہے۔ ہجر اور جدائی کے لمحے مختلف زمانوں میں مختلف انسانوں سے مختلف باتیں کرتے ہیں کبھی یہ مایوسی اور ڈپریشن کے اتھا اندھیروں میں گرا دیتے ہیں اور کبھی جدائی کے دکھ کو دوسرے انسانوں کے لئے وصال کی خوشیوں میں بدل دیتے ہیں۔ ان کی ذات کا خلوص ہجر اور جدائی کے لمحوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے جو قوس قزح کی طرح خوبصورت ہیں اور یوں ہلکے رنگوں اور سردیوں کی دھوپ جیسی یہ شاعری قاری کو آسودگی کی منزلوں کی طرف لے جاتی ہے یہ دکھوں کی تہذیب ہے اور میں شہناز مزمل کو اس ارفع رویئے کی شاعری پر مبارک باد دیتا ہوں

عطاء الحق قاسمی

شہناز مزمل ایک شائستہ اور شستہ خاتون ہے۔ ان کا شریفانہ اسلوب شعر ایک مثبت تاثر دل پر طاری کرتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ساتھ ذرا دیر سے ادبی دنیا میں ظاہر ہوئی

ہیں مگر اتنی ہی جلدی ایک مقام بنانے میں کامیاب رہی ہیں کہا گیا ہے کہ کتابیں گھروں کی طرح ہوتی ہیں ان میں رہنا چاہیے۔ شہناز شاعری کو بھی ایک اچھے گھر کا منظر دینا چاہتی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کی موثر موجودگی ایک اعزاز کی طرح ہے۔ بلاشبہ وہ ایک معزز شاعرہ ہیں۔

ڈاکٹر اجمل نیازی

جس معاشرے میں عورت کی تخلیقی گواہی کو رد کرنے کی روایت پڑ جائے۔ وہ معاشرہ تہذیبی، سماجی اور ثقافتی سطح پر بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے۔
ہماری تیسری دنیا کے زیادہ تر معاشروں کی بد نصیبی رہی ہے کہ ہم نے تخلیق کی بجائے تقلید کو اپنی زندگی کا چلن بنا رکھا ہے۔ ہم آنکھیں بند کئے دوسروں کو دیکھتے ہوئے خوابوں میں اسیر رہتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ہماری پلکوں سے کسی نئے خواب کی پرچھائیں نہ چھو جائے۔
شہناز مزمل ہماری ایسی غیر تخلیقی روایت میں لفظ اور خواب کے حوالے سے ایک زندہ اور تخلیقی گواہی بن کر ظاہر ہوئی ہے۔ ان کی شاعری ہماری تہذیب کے کھنڈر سے طلوع ہوتی ہوئی کسی صبح کی مانند ہے۔ سچی اور خوبصورت۔

نذیر قیصر

## شہناز مزمل۔ ایک منفرد کائناتی شاعرہ

ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، پروین شاکر، پروین فنا سید، شبنم شکیل، فاطمہ حسن جیسے ناموں کے بعد نوشی گیلانی، ڈاکٹر انجم عارف، یاسمین حمید اور شہناز مزمل کے نام ادب کے منظرنامے پر روشن ہوئے ہیں۔ شہناز مزمل کا راستہ ان تمام سے مختلف ہے۔ اس سے مراد کسی بھی شاعرہ کو رد کرنا ہرگز نہیں۔ ہر کسی کا اپنا اپنا

مضبوط حوالہ ہے۔

شہناز مزمل اپنے ہونے کو محسوس کرنے اور اپنے گمشدہ تشخص کو ڈھونڈنے میں صبح و مسا سرگرداں ہے۔ وہ اپنے آپ کو کائنات سے جوڑنے کی سعی کر رہی ہے۔ اسے انسانی بے بسی اور بے چارگی پر غصہ بھی آتا ہے، وہ دریدہ دامن، سربریدہ خواہشات کرب کے رتجگوں اور نیم جاں سر [illegible] سے آگے نکل کر حرف نامعلوم کے علاقے میں جانے کے لئے بے تاب ہے، مگر اسے احساس ہے۔

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
اور ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج کی لمبی اڑانوں کو
کہ سب کے سب تو خود کھوئے ہوئے ہیں
اور اپنی چمکتی تیز آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے
تو یوں تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے ہوئے ہیں
سمندر دور، دریا دور، بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ منزل بے نشان ہے
کسی دیوار کا سایا
کوئی بارانِ رحمت کی ردا سر پر نہیں ہے
کہ جتنے سائباں ہیں سب کے سب ہیں موم کے جاناں

شہناز کے ہاں جاناں، بہت معنویت کا حامل ہے، یہ ایک زندہ کردار کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہے، جیسے کوئی رازداں سہیلی ہو۔ یہ جاناں فراز کے جاناں سے بہت مختلف ہے۔ یہ شہناز کا اپنا ہی پرتو ہے جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ سانجھا کرتی ہے،

منصوبے بناتی ہے' پیمان باندھتی ہے' وہ اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتی ہے' اس سے اس کی دوسروں پر بے یقینی بھی منعکس ہوتی ہے' تاہم اس نے جاناں کو تنہائی بنا کر اپنی ایک دنیا بسائی ہوئی ہے۔

یہ بات مذکورہ بالا کائناتی حوالے کو تقویت دیتی ہے۔ وہ خود کہتی ہے۔

بادل سا ہوں وجود مرا آسمان پر
میں بھی ہوا کے دوش پہ ہر سو اڑا کروں

میں بھی زمیں کے پانیوں پر عکس بن سکوں
میں اس کی موج میں خود کو بکھیر دوں

گہرے حسین ساگروں کے ساتھ بہہ سکوں
میں تہہ میں اس کی سیپوں کے ساتھ رہ سکوں

جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو
یہ آبشار جھرنے یہ بادل برس پڑیں

یہ تتلیاں' یہ جھیل' سمندر یہ کہسار
خود اپنی وسعتوں میں مجھے بھی سمیٹ لیں

اس حوالے سے شہناز رومانٹک شاعروں Romantic Poets کی صف میں آجاتی ہیں (انگریزی تنقید میں رومانٹک سے مراد صرف رومانوی نہیں) مثلاً" Keets Shelley اور Words Worth کی شاعری میں کچھ اس طرح کی کیفیت

دیکھی جا سکتی ہے Shelly اپنی ایک نظم West Wind میں کہتا ہے

Oh Lift me as a wave a leaf a cloud!

I fall upon the thorns of life! I bleed!

یہ اسلوب ہر بے چین فنکار کا ہونا چاہیے۔ شہناز بھی فصیل جان میں مقید طلسم جاں کا عذاب سہہ رہی ہے اور دائمی سکون کی متلاشی ہے۔ وہ Dr.Fausties کی طرح طاقت کا حصول شیطانی طاقتوں کے ذریعہ نہیں کرنا چاہتی۔ وہ دست دعا پھیلاتی ہے اور خدا سے اپنے لاڈلے انداز میں شکوہ بھی کرتی ہے۔

ہو گر اجازت تو پوچھنے کا
مجھ بھی اتنا تو حق ہے حاصل
مرے لئے گر نہیں تھا کچھ بھی
کوئی ستارا
کوئی کنارا
تو کیوں سجائی تھی بزم ساری

شہناز مزمل اپنے اندر حوصلہ بھی خود ہی پیدا کرتی ہے' وہ بہت باہمت دکھائی دیتی ہے۔

فضائیں دھند میں لپٹی ہوئی ہیں
تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر کھولنا ہونگے
تجھے در کھولنا ہونگے

شہناز کی اور بہت سی خوبصورت نظمیں ہیں جو دیباچے کی طوالت کے باعث کوٹ نہیں کی جا سکتیں۔

شہناز مزمل کے ہاں غزل بھی اچھی ہے مگر اس پر بھی نظم کا رنگ غالب ہے' ا
نظم کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے خوشی کی بات یہ کہ اس نے بے
جذبوں اور بے شمار موضوعات کے باوجود نثری نظم کا سہارا نہیں لیا۔ یقیناً" وہ مجو
ہے کہ شاعری اور نثر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آج کی نثری نظم افضال سید' انیس نا
اور نسرین انجم بھٹی تک تو مانی جا سکتی ہے وہ بھی تھماٹ کی حد تک۔
بعض جگہ اس نے غزل بھی نہایت خوبصورت انداز میں کہی ہے' ایک جداگانہ طریہ
ہے

اتنا احساس ندامت نہ دلایا جائے
فیصلہ جرم کا اک بار سنایا جائے

زرد رت کا فضا پہ پہرہ ہے
موسم گل کہاں پہ ٹھہرا ہے

گردشِ دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں

یہ چشم تر مری پتھرا گئی تو کیا ہوگا
یقیں کی آخری حد آ گئی تو کیا ہوگا
تلاشِ جذب میں دنیا تیاگ سکتی ہوں
سکوت وشت سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کماں سے گزر
رہے فاصلے مرے منتظر میں تو جسم و جاں سے گزر

اس شعری مجموعے میں شہناز مزمل نے بھرپور شاعری کی ہے اور وہ تخلیقی سطح پر شعر کہنے کے لطف اور کرب کو ساتھ ساتھ محسوس کرتی ہے یقیناً" وہ بڑی توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو ہم اس سے اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

سعد اللہ شاہ

## شہناز مزمل صاحبہ کی شاعری

اردو ادب میں ادبی ماضی سے تعلق رکھنے والے شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ماضی یا گزشتہ سے پوستہ اقدار و روایات میں سانس لیتے ہیں۔ عہد ماضی اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں 'عصری تقاضوں' ماحولیات اور اردگرد کی دنیا و حالات پر نظر ڈالتے ہوئے تذبذب کا شکار ہوتے ہیں یا پھر عصری تقاضوں کے چیلنج سے گھبراتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اپنے زمانے سے قطع تعلقی پر اتر آتے ہیں۔

دوسرا طبقہ یا گروہ ان شاعروں' ادیبوں اور قلمکاروں کا ہوتا ہے۔ جو سانس تو اپنے زمانے ہی میں لیتے ہیں لیکن ان کی شعری بصارت ' ادبی بصیرت اور فکر ارتقاء کے دھار سے ماضی کے اقدار بھی کبھی اوجھل نہیں ہونے پاتیں وہ ماضی کی روایت کو عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرکے ایسا فن پارہ تخلیق کرتے ہیں جو اپنے عہد کا نمائندہ ادب کہلاتا ہے ' وہ ماضی کی صحت مند' وقیع اور زندہ رہنے والی اقدار و روایات کو اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور یہ کسی روایتی شاعر کے بس کا روگ نہیں

شہناز مزمل صاحبہ دوسرے طبقہ کی نمائندہ شاعرہ ہیں ' بلاشبہ ماضی کی اقدار و روایات کی تام جھام کے ساتھ نئی شعری تخلیقات کا عمر رواں سے منظم ربط ان کا خاصا ہے۔ شعری سفر کی لسانی تاریخ میں وہ اپنا ایک منفرد مقام بنا چکی ہیں۔ نظم ہو یا غزل اتنی بجی ہوئی ہوتی ہے کہ معنی کے مفہوم کی ترسیل بلکہ ابلاغ واضح انداز میں قاری تک پہنچتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست ' روانی و تسلسل' موسیقیت و ترنم ' اس کے اضافی جزو ہیں اور یہی جزیات جب کل کی شکل اختیار کرتے ہیں تو شہناز صاحبہ کے فن کی آبیاری ہوتی ہے شہناز مزمل صاحبہ کسی گروہ بندی یا ازم کا شکار نہیں ہوئیں ان کی شاعری پر کسی قسم کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ تو صرف اور صرف انسانیت کی شاعرہ ہیں اور یہی ان کی شاعری کا حسن ہے۔

کرامت بخاری

بسم اللہ الرحمان الرحمان

# در شمائل محترمہ شہناز مزمل صاحبہ

ہوئیں پیدا ہمارے ملک میں اک ایسی دانشور
صفات ان کی بیاں کرنا بہت مشکل ہے سرتا سر
ہے شہناز مزمل نام ان کا حامل برکت
ہے ان پر حق تعالٰی کا بہت ہی فضل اور رحمت
ادیبہ شاعرہ ہیں اور مبلغہ مصلحہ ہیں وہ
مجسم خلق اور احسان، طیبہ طاہرہ ہیں وہ
بلند اخلاق ہے ایسا مثال ان کی نہیں ملتی
جو ان سے ملتے ہیں کوئی کمی ان کو نہیں ملتی
تصانیف اور تالیفات ان کی ہیں بہت اعلٰی
ہوا ہے جن سے سارے ملک میں شہرہ بڑا ان کا
کلام ان کا ہے دل آویز شیرینی میں ندرت میں
تفکر میں تخیل میں فصاحت میں بلاغت میں
خزانہ علم و حکمت کا ہے اک ان کی حفاظت میں
کتب خانہ بڑا ہے شہر کا ان کی نظامت میں
ادیبوں شاعروں میں ان کا چرچا ہے زمانے میں
کتب خانے کا ان کے خوب شہرہ ہے زمانے میں
ہے قابل تقلید ان کی ذات ارفع و اقدس
کمالات و صفات حسنہ کی حامل ہیں ہیں ازبس
بڑی عزت ہے ان کی صاحبان علم و حکمت میں
خدا ان کو حفاظت میں رکھے خود اپنی رحمت میں
اور ان کی عمر و اوصاف حمیدہ میں بھی برکت دے

انیس رحمانی

لاہور ۲۵ فروری ۱۹۹۳ء

محترمہ کے ساتھ "ایک شام" کی تقریب میں
زیر صدارت ڈاکٹر وحید قریشی

## محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل

### ایک شاعرہ

لفظوں کی دنیا کی باسی
لفظ کھلونے اس کے جن میں
سارا بچپن گزرا ہے
لفظ ہی اس کی
بھورے بالوں، نیلی آنکھوں والی گڑیا
لفظ ہی اس کے
وہ معصوم پرندے جن سے
دن بھر کھیلا کرتی تھی
لفظ ہی اس کی
نیلی، پیلی، اودے، بھورے
سرخ سفید اور نارنجی رنگوں کی تتلی
لفظ ہی اس کے کنگن، چوڑی
ماتھے کی بندیا اور ٹیکا
لفظ گلے کی مالا اس کے
لفظ ہی اس کے ناک کی تھلی

## محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل

### ایک شاعرہ

لفظوں کی دنیا کی باسی
لفظ کھلونے اس کے جن میں
سارا بچپن گزرا ہے
لفظ ہی اس کی
بھورے بالوں، نیلی آنکھوں والی گڑیا
لفظ ہی اس کے
وہ معصوم پرندے جن سے
دن بھر کھیلا کرتی تھی
لفظ ہی اس کی
نیلے، پیلے، اودے، بھورے
سرخ سفید اور نارنجی رنگوں کی تتلی
لفظ ہی اس کے کنگن، چوڑی
ماتھے کی بندیا اور ٹیکا
لفظ گلے کی مالا اس کے
لفظ ہی اس کے ناک کی تھالی

لفظ ہی اس کے۔۔۔۔کی شوبھا

لفظ ہی سارا ہار سنگھار

اس کے خوابوں میں بھی ایک سجیلا لفظ چھپا تھا

اور اب جب سے

۔۔میں۔۔۔۔نے آنکھیں کھولیں

آگ بدن میں روشنی تھی جو

کچھ مدھم سی کتنی ہے۔

ایسے میں بھی

لفظوں کی مدت ہے جو کہ

اک اک رگ میں اُترتی ہے

لفظوں نے ہی

بھرے

زندہ ہونے کا احساس دیا ہے۔

## محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل کی نذر

غزل۔

موج تازہ خیال تیرے ہیں

شعر سب باکمال تیرے ہیں

تو ہے فنکا ،عصر حاضر میں

آئینے بے مثال تیرے ہیں

یہ تغزل ہے تیرا سرمایہ
لفظ و معنٰی بھی مال تیرے ہیں

تلخیوں میں ادھورے خوابوں کی
حوصلے کب نڈھال تیرے ہیں
اچھے لگتے ہیں جھنگ والوں کو
شعر جو پُر جمال تیرے ہیں

آ کے بیٹھے ہیں بزم میں تیری
یہ پرندے، غزال تیرے ہیں

تیرگی کی رتیں ہو ئیں رخصت
یہ اُجالے سنبھال تیرے ہیں

میں یقیں سے یہ لکھ رہا ہوں عدیل
نقشِ پا لازوال تیرے ہیں

ابراہیم عدیل
نزد باب علی
جھنگ شہر

# تین شعر بطور دعائیہ

ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ کے لئے پیش کرتا ہوں

شہناز مزمل ہماری بیٹی ہے یہ بیٹی ہر دم شاد رہے
ہر شعر بھی اس کا زندہ ہے شاعری بھی زندہ باد رہے

یہ ادب کی خدمت کرتی رہے سب خواب بھی پورے ہو جائیں
خوش حال رہے خوش بخت رہے اس دھرتی پر آباد رہے

مولا محفوظ رکھے اس کو اختر کی دعائیں شامل ہیں
اسے جھنگ کی محفل یاد رہے اسے آج کی شام بھی یاد رہے

اختر بھٹی

05/12/1999

## ڈاکٹر شہناز مزمّل

کے شعری مجموعہ ''میرے خواب ادھورے ہیں'' کی تعارفی تقریب کے موقعہ پر ان کے لئے ایک نظم۔

آرزو کا چمن رہے زندہ
تیری طرزِ سخن رہے زندہ
خواب تیرے ادھورے ہیں لیکن
یہ دعا ہے کہ فن رہے زندہ
یوں ہی مہکے بہار آنگن میں

شاعری کا بدن رہے زندہ
تُو بھی فنکار میں بھی اک فنکار
یہ ادب کا ملن رہے زندہ
پاؤں کے نیچے زمین ہو سجاد
سر کے اوپر گگن رہے زندہ

سجاد بخاری
ایڈووکیٹ جھنگ صدر
0441-5051

## امبر عمران امبر

آبروئے گلاب لکھی ہے
تم نے جو کتاب لکھی ہے
تبصرہ اس پہ اور کیا لکھوں
نظم بھی لاجواب لکھی ہے
بعض شعروں سے ایسا لگتا ہے
سرگذشتِ عذاب لکھی ہے
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تعبیریں
تم نے رودادِ خواب لکھی ہے
داستان اِک فراق کی شہناز
کس لئے بے حساب لکھی ہے
یہ کہانی غمِ محبت کی
صورتِ ماہتاب لکھی ہے
تم نے بھی میری ہی طرح امبر
زندگانی عذاب لکھی ہے

امبر عمران امبر
اندرون چوک بازار گلی پٹھاناں والی مکان
نمبر 526/13 جھنگ صدر

01/12/1999

# پنجابی غزل

ظلم دی ہر تصویر مٹائی جاسکدی سی
نفرت دی دیوار تاں ڈھائی جاسکدی سی
شیراں وانگ میں ھک وچ نیزاہ کھاہدا سی
بزدل بن کے جان بچائی جاسکدی سی
اپنے ہتھس چپو توڑ کے سٹ دتے سن
ورنہ بیڑی پار لگائی جا سکدی سی
بجھے بند اکھاں دے جے کر ٹٹ جاندے
بن موسم برسات منائی جاسکدی سی
رحمتاں والی واج جے پے جاندی شہناز
فیر ملن دی آس لگائی جاسکدی سی

# سرائیکی غزل

ترے باجھ جھڑی گزری او زندگی تے کائی نئیں
ویڑھیا چدھارو درداں ہک پل وی ڈینڈے سائی نئیں

اوکھی تھے بھاویں سوکھی آخر گزر تا ویندی
افسوس بس ایں گل دا کہ توڑ تیں نبھائی نئیں

سب کج اساں بھلایا کج وی تاں مل نہ پایا
ایں بھید کیویں کھولاں پلے کوئی کمائی نئیں

راھواں نوں لبھدے لبھدے ایں وقت آگیا ہے
شہناز تاں ہے کملی ڈیندا وی کج ڈکھائی نئیں

مصرع لرزاں

---

# طویل مسافتوں کی شاعرہ

از عثمان صدیقی

ع دیکھنا تقریر کی لذت کہ، جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے (غالب)

ہاں تو یہ کیفیت محرک ہوئی کہ شہناز مزمل صاحبہ پر کچھ لکھا جائے۔ ایسی معروف شاعرہ پر لکھنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں۔ لہذا خیال عمل کا جامہ نہ پہن پایا۔ مگر ''ادب سرائے'' ماڈل ٹاؤن کے ماہانہ مشاعروں میں کئی ماہ متواتر شرکت نے مہمیز کیا کہ اگر کچھ لکھنا ہے تو تاخیر کیوں؟

ان کی شدت احساس میں ڈوبی ہوئی نظموں اور سوز سے معمور غزلوں نے چند بار احساس دلایا کہ ان کی شاعری کو قلم کی جولانگاہ بنایا جائے۔ وہ یقیناً بڑی شاعرہ ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ جو ان پر قلم اٹھائے وہ ایسا ہی معروف ہو پھر:

ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

چنانچہ ان کی شعری مجموعوں کا مطالعہ کیا۔ محترمہ کی شخصیت سے تو کوئی تعارف نہ تھا، نہ یہ معلوم کہ ان کا شعری شعور کس طرح پروان چڑھا، کن مراحل سے گزرا، مذاق شعری کی تربیت کس طرح ہوئی اور شعر گوئی کی اس پختگی کو وہ کتنے ہفت خواں طے کر کے پہنچیں، لہذا ساری رہنمائی

ان کے شعری مجموعوں ہی سے حاصل کی۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ کہا اور لکھا ہو گا مگر میری رسائی ان کی صرف چار شعری تخلیقات تک ہو سکی۔ ''موم کے سائبان''، ''میرے خواب ادھورے''، ''عکس دیوار پر تصویر'' اور ''جادہ عرفان''۔

شہناز صاحبہ کی شاعری کا محور سوز دروں، غم پنہاں و غم دوراں ہے۔ شعری مجموعوں میں درج شدہ کوائف کی روشنی میں وہ زندگی میں نہایت کامیاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ پایا ہے جس کی عام طور پر خواہش کی جاتی ہے۔ ملک گیر شہرت کی حامل شاعرہ ہیں۔ انجمنوں کی صدر نشینی ان کے لیے جگہ جگہ دامن کشادہ کیے ہوئے ہے۔ لائبریریاں ان کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی بانی چیف لائبریرین ہیں۔ ''ادب سرائے'' کی تاحیات چیئر پرسن ہیں۔ دوبار ایوارڈ برائے حسن کارکردگی عطا کیا گیا۔ ادبی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ جنگ ٹیلنٹ ایوارڈ سے بھی وہ مفتخر ہوئیں۔ یہ تصریح صرف اس لئے ہے کہ بظاہر زندگی کامیاب ہے۔ تو پھر یہ سارا سوز یہ غم والم، یہ بکا کی کیفیت، یہ تاریکیوں کا ذکر، یہ شکست وریخت، یہ گریہ، یہ رتجگے، یہ طویل مسافتیں، یہ آبلہ پائی، یہ لاحاصلی کا غم، یہ شب گزیدگی، یہ بے ثباتی کا شدید احساس، یہ دائروں کے پیچاک میں گمشدگی، اصلی چہرے پر نیا چہرہ سجانا، یہ خموشی کی جانکنی، تنہا نہ ہوتے ہوئے کرب تنہائی، یہ خود سے فرار، یہ کڑی دھوپ میں شکستہ پائی، یہ فسوں زدگی، یہ تمناؤں کے حصار میں محصوری، کبھی اپنی دعاؤں میں اثر دیکھنا، کبھی اندھی شب میں اندھے سوال، وحشت شب میں خود کلامی، اعصاب شکنی، موم کے سائباں میں بے سائبانی، ماورائے حیات وکائنات، سفر ملاء اعلیٰ کی تصوراتی لہریں، آخران سب کے سوتے کہاں ہیں؟ یہ ہیں شدت احساس ہیں، یہ شدت احساس ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ یہ تمام غموں کو اپنا غم بنانے کی بات ہے۔ یہ جملہ شدائد جہاں پر اشک ریزی ہے۔ یہ بے ثباتی حیات کا غم ہے۔ یہ حالات کی بے یقینی کا ماتم ہے۔ یہ وہ دکھ ہیں جنہیں الفاظ کے جامے میں بمشکل منتقل کیا جا سکتا ہے۔ وہ پرسوز طرز احساس ہے جس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ اکثریت کی سوچ بالکل مختلف ہے جو ٹھیٹھ مادی ہے، وہ ارفع اقدار پر نظر

جیسا کہ انہوں لکھا ہے، مجسم شاعری تھے۔ اس طرح انہیں گھر ہی میں شاعرانہ فن کی تہذیب وتربیت کا شاندار موقع ملا۔ شعوری کی ابتدا شعر کے ماحول میں ہوئی یہ کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی زبان، یہ شستہ لہجہ، یہ انداز بیاں یہ محاکات، یہ لفظوں کی تجلیات، یہ خاموش ضائع بدائع کی پیوستگی، یہ معانی کی اثرانگیزی، یہ سب اس ماحول کی دین ہے۔ پھر اپنی محنت وکاوش عرصہ تک خود ضبطی، یکا یک ۱۹۸۹ء میں پیش منظر اور چند سال کے مختصر عرصہ میں چونکا دینے والے متعدد شعری مجموعے اور ''منفرد کائناتی شاعرہ'' کا خراج تحسین۔

موم کے سائباں ان کی معرکتہ الآرا نظم ہے اور کسی بھی زبان کے ادب عدلیہ کی نظموں کی ہم پہلو ہے اس کی امیجری بھرپور ہے۔ خیال اچھوتا ہے اور شعری اظہار دلنشین ہے۔ نظم میں برگد اور سائباں عظیم علامتیں ہیں۔ برگد بجائے خود سائباں کی بڑی وسیع علامت ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفات پر ڈاکٹر وزیر آغا نے جو مضمون ''ادبی دنیا'' میں بطور خراج تحسین لکھا تھا، اس کا عنوان ''برگد'' تھا۔ مرحوم شعرا وادبا کے لیے سائبان کی حثیت رکھتے تھے۔ یہ ہے برگد کی علامت کی اہمیت۔ نظم تو ظاہر ہے یہاں نقل نہیں جاسکتی چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

سکوت شام میں بجتی ہوئی گھنٹی کی آوازیں
افق میں ڈوبتے سورج کی سرخی
فضا میں تیرتے بادل کے ٹکڑے
ہجوم بیکراں ہے
کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
سمندر دور، دریا دور، بادل دور ہیں جاناں

نہیں رکھتے۔ تو پھر کوئی شریک سفر ہو تو ساز کی بات بنے۔ لہذا سوز، سوز ہی رہتا ہے۔ جب تک اجتماعی شعور اس سوز کی ساخت بدلنے پر آمادہ نہ ہو۔ سوز کے ساتھ ساز کی صورت نہیں بنتی۔ ورنہ جو سوز شہناز کی شاعری میں جاری وساری ہے اسی طرح رہے گا۔

جو کیفیات بیان کی گئی ہیں وہ کسی پیہم یاس اس کو پیش نہیں کرتیں وہ اپنی کربنا کی سے مل کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شہناز اضمحلال کا ہدف بن جاتیں پھر نہ یہ کیفیت باالتکرار سامنے آتی اور نہ اس طرز احساس کی جوت کو بار بار جگایا جا سکتا۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد عالم سکوت ہوتا اور شکست خوردگی۔ لہجے کا یہ رچاؤ نہ ہوتا، شعر کا یہ سبھاؤ نہ ہوتا، جاذبیت ساتھ چھوڑ جاتی، جذبات راکھ ڈھیر بن جاتے۔ وہ اس طرح شعلہ فشاں نہ ہوتے۔ پُرسوز آواز بار بار نہ چونکاتی۔ لہذا یہاں شکست خوردگی نہیں۔ اضمحلال نہیں، حوصلہ ہے اور صلائے عام ہے کہ حوصلہ اس طرح زندگی کا شعور بدل سکتا ہے۔ زندگی کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو خوشگوار اور ہموار بنا سکتا ہے، دل میں جب تک کسک نہ ہو، احساس زیاں نہ ہو، اپنے طرز احساس میں دوسروں کو شریک کرنے کی تمنا اور کاوش نہ ہو، کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

شہناز کا دھیما پرسوز انداز دراصل درون دل ناانصافیوں اور ناہمواریوں سے دعوت مبارزت دیتا ہے، وہ احساس اور ولولہ عطا کرتا ہے جس سے بے ثباتی سے محکمی کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ جہاں مادیت کی جگہ اقدار کی اہمیت ہوتی ہے۔ تصنع کی جگہ حقیقت پسندی شعار بنتی ہے جب شکست وریخت کے بجائے تعمیر وترقی درون دل مرکز خیال ہوتی ہے تو آواز دل میں اترتی ہے، اثر کرتی ہے، ہم خیال بناتی ہے، اور پھر بے ترتیبی کو تشکیل دینے کے لیے ہم قدمی کی دعوت دیتی ہے، طویل مسافتوں کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اس طرح جادہ حیات اور جادۂ عرفان پر کارواں رواں ہوتا ہے۔

یہ تھا مجموعی کیفیت کا اظہار اب شہناز کی شاعری کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ شہناز کی شعری تربیت بھرپور شاعرانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کے والد حشر القادری مرحوم

کڑی ہے دھوپ منزل بے نشاں ہے

کہ جتنے سائبان ہیں سب کے سب موم کے جاناں

ظاہر ہے موم کے سائباں قائم تو نہیں رہ سکتے، لہذا وسیع تر معنوں میں شاعرہ کو احساس ہے کہ ہم سب، ملک وقوم، ساری کائنات اس موم کے سائباں کے زیر سایہ کب رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ انجام کار حیات وکائنات سرتاسر بے سائبان ہیں۔ دردناک صورت حال سے دوچار ہیں۔ بے بس اور بے آسرا ہیں۔

'جاناں' جو شہناز کی شاعری میں جا بجا ہے 'موم کے سائباں' میں بھرپور انداز میں جلوہ گر ہے۔ گنجائش نہیں کہ اس پر طویل بات ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ 'جاناں' شہناز کی خود آگہی کا پیکر ہے۔ یہ ان کا متشکل اندرون ہے۔ درونِ خود (self) ہے، ان کا رفیق ہے، دم قدم کے ساتھ ہے، جہاں آیا ہے نہایت خوبصورت انداز میں آیا ہے۔ جب شہناز اسے اپنی زبان سے ادا کرتی ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کا جمال دروں ہے اور شریک اسرار اندروں ہے۔

آگہی ہر ایک کو کہاں میسر، شہناز کو آگہی کی عطا ہے مگر ساتھ ساتھ اس جرم کی سزا بھی۔ نظم ''جرم آگہی'' میں کہتی ہیں:

ع رقص ہے شعلوں کا

اور دامن دریدہ ہے مرا

سربریدہ خواہشوں کو ساتھ لے کر

رت جگے کے کرب جھیلوں

بے ارادہ نیم جاں سرگوشیاں کرتی رہوں

میں صلیب وقت پر مصلوب ہوں

نظم ''ابھی سورج کو جلنا ہے'' میں سورج جل رہا ہے اور تا قیامت جلتا رہے گا۔ سورج

روشنی کا قدیمی استعادہ ہے اور شہناز اس کو ہمیشہ جلتا اس لیے دیکھنا چاہتی ہیں کہ اس کی روشنی بکھیر سکیں۔ یہ ہے آرزو روشنی حاصل کرنے اور روشنی عام کرنے کی۔

''موم کے سائباں'' کی تمام نظمیں فکر علامات سے معمور ہیں اور خاموش پر سوز فکری دعوت دیتی ہیں۔ نظمیں ''لاحاصل کی سرزمین'' کڑی سزا ''رتجگوں کی مسافت''، ''بے کلی''، ''برزخِ احساس''، ''زرد موسم کے عذاب''، ''شب گزیدہ''، ''دائروں کے درمیاں بنتا شہر'' کیا کیا افکار و تیور نہ لیے ہوئے ہیں۔ ساتھ ساتھ حسن ساخت کا نادر نمونہ ہیں۔

بہت لمبی مسافت
رتجگوں کی میں نے کاٹی ہے
کسی بھی پرسکون ساعت کا
کوئی بھی حسین لمحہ
مری بے خواب آنکھوں میں اتر آئے
کہ اب تو
ضبط گریہ جاں لیوا ہوتا جاتا ہے

میں نے شہناز صاحبہ کو عنوان میں مصرعہ لرزاں کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اک لرزش خفی ان کی ساری شاعری میں ہے۔ احساس کا ارتعاش، کاوش ہے حیات و کائنات کے مسائل و حقائق پر نظر ڈالنے کی، استعجاب کی، مداوائے درد دل کی، جستجوئے سکوں کی، بے کلی سے نجات پانے کی، برزخ احساس میں جینے کی، مصرع کی اثر شہناز کی شخصیت اور ظہار و بیان کی رواں کیفیت کو سامنے لاتی ہے۔ یہ کسک ہے جو انہیں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔

میرے دل میں کسی گزرے ہوئے لمحہ کی کسک
جانے کیوں آنکھ کی پتلی میں اتر آئی ہے

ہر گھڑی گھٹتی ہوئی قوت گویائی کو
کوئی جذبہ کوئی احساس ہی بخشا جائے
چار سو پھیلا ہوا مرگ تمنا کا سکوت
منتظر ہے کسی ناقوس مسیحائی کا (کسک)

شب گزیدگی اور تنہائی کی اس کیفیت کو کون سمجھتا ہے، وہی جو اس طرح کی کربناک صورت حال سے گزرا ہو، شدت احساس نے اس اس طرح جکڑا ہو، وحشت ناک پریشان خیالی گھیرے ہوئے ہو، بے ساختہ اظہار و بیاں کتنی دل پذیر اور جانکاہ تصویر پیش کرتا ہے۔

شب گزیدہ کے لیے آج تو دشوار ہے رات
کچھ سفر اور ابھی اور سفر باقی ہے
ہجر کا کرب لیے دکھ کے سمندر کی طرف
کوچۂ شہر تمنائے گزرنا ہو گا
کون سمجھے گا مری روح کے آزار کو آج
کون ہمدم مری تنہائی کا ہو گا جاناں (شب گزیدہ)

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ لہجہ، یہ انداز بیاں، یہ خیالات کی رو، یہ تصور کی گہرائی ان کی شاعری میں یونہی نہیں در آئی، اس کے پس پشت بڑا ریاض ہے۔ شعر و ادب کا وسیع مطالعہ ہے، اردو کے شعرائے قدیم و جدید کے علاوہ انگریزی بالخصوص رومانوی دور کے شعرا کے کلام کا وسیع مطالعہ بھی اس انداز بیان پر دلالت کرتا ہے۔

فراق نے کہا ہے:

میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراق
آج جس کی نرم لو ہے شمع محراب حیات

یہ بات فراق کے بیشتر کلام پر صادق ہے، جبکہ شہناز کے کل کلام پر۔ دراصل تنگنائے یک مضمون شہناز کے کلام کی قدر روانی (Appreciation) کے لیے بہت محدود ہے۔ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ ان پر لکھنا ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ اس طرح کہیں بھی رک کر لکھنا یعنی مفصل بات کرنا، کار دشوار ہے۔ دیکھئے کیفیت اور اثر انگیزی سے معمور، خوبصورت انداز بیاں محاکات کے ساتھ:

ع

خوشبو نے ہر اک سمت بکھیرے ہیں نئے رنگ
موسم کا طلسم آج جگاتا ہے کئی زخم
احساس کی زنجیر مجھے باندھ رہی ہے
ہے شور فضا میں کوئی طوفان اٹھا ہے
سرکش ہے ہر اک موج کوئی راہ نہیں ہے
گزرے ہوئے لمحوں کی خلش آج مجھے کیوں
تنہائی کے جنگل کی طرف کھینچ رہی ہے

(احساس کی زنجیر)

''برزخ احساس'' میں شہناز کی آنکھیں نیند کی منتظر ہیں۔

بہت زمانے سے ہے آنکھ منتظر میری
نہ جانے کتنے دنوں سے پلک نہیں جھپکی

دیکھیں اپنی ذات پر اختیار کی تمنا کس طرح دل میں مضطرب ہے:

ع جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو

جب اطراف میں شکست و ریخت ہی نظر آئے تو پھر شکستہ آئینوں میں صورتیں بکھری

ہی نظر آئیں گی، آرزوئیں نڈھال ہوں گی، آبادیاں دائروں میں محصور کشمکش میں نظر آئیں گی۔
لیکن صورت حال شہناز کے لیے مایوس کن نہیں عزم ہے، حوصلہ ہے۔ کہتی ہیں:

فضائیں دھند میں لپٹی ہوئی ہیں
مجھے پرواز کرنا ہے
مجھے پر کھولنا ہوں گے
مجھے در کھولنا ہوں گے

بات یہ ہے:

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

حقیقتاً شہناز کی اپنے ماحول پر، ماحول کے تانے بانے اور جبریت پر گہری نظر ہے۔ نظم 'سوال' میں کہتی ہیں:

ہمیں جانا کہاں ہے
کون جانے کون سے رستے پر چلنا ہے
کہ یہ رستہ
تو اپنی راہ بدل لیتا ہے سنگِ میل سے پہلے

ان کی نادیدہ خواہشیں ان کے ساتھ ہیں اور تکمیل کی جستجو میں ہیں۔

ع کوئی بھی ادھورا نہیں ہوتا جاناں

حالات کے بدلنے کی آرزو کیسی جاندار ہے۔

فضائیں اس قدر ساکت سی کیوں ہیں

کوئی نغمہ ہواؤں میں نہیں ہے

خموشی جان لیوا ہو گئی ہے

چلے آؤ کوئی طوفان اٹھانے

کوئی آہٹ کوئی آواز تو ہو

گھٹا کے سنگ چمکیں بجلیاں بھی

یہ ہے صورت حال کو بدلنے کی آرزو۔

اپنے کرب کو چھپانا، خوش باش نظر آنا، حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرنا، خندہ پیشانی سے حالات کا مقابلہ کرنا، دوسروں کو حوصلہ دینا۔ یہ ہے شہناز کی خصوصیت جو پیغام دیتی ہے جگر داری۔

وہ عام روابط میں ''اصلی چہرے پر نیا چہرہ'' سجائے رکھتی ہیں۔

جب بناتی ہوں تمناؤں کا مدفن کوئی

خوب ہنستی ہوں میں خود اپنی ہی بربادی پر

دن تو کٹ جاتا ہے ہر درد پہ ہنستے ہنستے

اصلی چہرے پہ نیا چہرہ سجا لیتی ہوں

خود کو کتنے ہی عذابوں سے بچا لیتی ہوں

نظم ایک مسلسل درد کی کیفیت کو ایک خاص رومانوی انداز میں پیش کرتی ہے، ساتھ ساتھ جینے کا حوصلہ اور جگر داری سے نمٹنے کا ولولہ دیتی ہے۔

جب اصلی چہرہ سامنے نہ ہو تو کوئی کس طرح کہے کہ انفرادی غم کتنا عمیق ہے۔ ہجر و فراق منتظر آنکھیں، شب فراق، اشک افشانی، خوش فشانی، گریہ اور ضبط گریہ کے سوتے کہاں ہیں۔ پچھتاوا کیا ہے، مگر جو بھی ہے، دلنشیں پیرائے میں اہلِ دل کو ایک کسک میں مبتلا کرتا ہوا ہے۔ کیا کچھ نہ ان مختصر نظموں میں کہا گیا ہے کہ قاری دل مسوسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظمیں ہیں کہ جذبات کا سیلاب رواں، عنوان کیسے اثر انگیز ہیں:

'اضطراب نارسا'، 'چھاؤں جلتی رہی'، 'بنجر آنکھیں'، 'آگ ہی آگ'، 'بے آب لہجہ'
'ریشم کی ڈور'، 'الکھ نگری'، 'دھند کے بعد'، 'عہد مخرف'، 'حصار خوف'، 'دشت تمازت' وغیرہ:
شہناز نے اپنی اندرونی کیفیت کو کس درجہ حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔
قطروں کے نشتر ہیں کہ رگ جاں میں اترتے ہیں:

یہ میرا ظاہری تبسم ہی
ساتھ اب میرا دے نہیں سکتا
آج کی رات کٹ بھی جائے اگر
زندگی کیسے کاٹ پاؤں گی (آگ ہی آگ)

مضطرب ذروں کی صورت اڑ رہی ہوں میں یہاں
رفتہ رفتہ گر رہی ہے میری یہ دیوار جاں
جان لیوا ہو گیا ہے یہ مسلسل اضطراب
ہمسفر آؤ اسی دلدل میں رستہ ڈھونڈ لیں (حصار خوف)

ان کی طویل مسافتیں سرحد امکاں کی تلاش میں ہیں، شعور کی حدوں سے آگے ہیں، تحت الشعور چھوڑ گئی ہیں بہت پیچھے اور لاشعوری سفر میں سرگرم ہیں۔ یہ فکر وشعور کی یہ حیات وکائنات کے معموں کی گرہ کشائی کی دعوت دیتی ہے۔

سفر امکاں ہے سوچتی ہوں
یہ لاشعوری سفر ہے میرا
شعور کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہوں
بہت ہی مشکل ہے منزلوں کے نشان پانا

مجھے ہے سوچوں کے پار جانا

فصیلِ جسم و جہاں سے آگے ہے مجھ کو جانا

اتنا کچھ کہنے کے بعد شہناز اپنی داستان کو نامکمل سمجھتی ہیں۔ اس لیے کہ جذبہ، فکر، حوصلہ کوئی حد نہیں رکھتے۔

اتنا لکھا ہے کہ ہے انگلیاں بھی میری فگار

اتنا سوچا ہے کہ اب سوچ بھی باقی نہ رہی

پردۂ فکر پہ ہیں ریت کے طوفاں چھائے

کیسے آگے میں بڑھوں رہتی ہوں اس سوچ میں گم

چشمِ بینا ہے بگولوں میں مقید جاناں

ظاہر ہے یہ کیفیت تو مستقلاً رہتی ہے کیونکہ شہناز نے اپنی ذات سے آگے نکلتے ہوئے حیات وکائنات کی گردشوں اور معموں کی سلجھانے کی ذمہ داری مول لی ہے۔ اگر وہ حافظ شیرازی کے اس شعر کی

مصداق رہتیں تو اس بے کلی سے بچی رہتیں:

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمہ را

مگر وہ تھک کر بیٹھنے والی نہیں، انہیں تو نہ صرف رازِ دہر کو پانا ہے بلکہ اسے پانے کی راہ بھی ہموار کرنی ہے، ان کی شاعری کا بیشتر حصہ الم انگیز ہے مگر ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی، فانی بدایوانی تو زندگی کو دیوانے کا خواب کہہ کر آگے بڑھ گئے:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ان کا یہ شعر بھی بڑا معنی خیز ہے۔ ہر چند کہ اس دور کے مروجہ پیرائے میں ہے:

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

بات ہے نبض کائنات کے ڈوبنے کی، یہی شعر کی جان ہے جبکہ شہناز نبض کائنات کو پیہم ڈوبتے دیکھ رہی ہیں مگر مزاجِ یار کی برہمی سے کہیں آگے مزاجِ کائنات کی برہمی پر جس کی شیرازہ بندی ان کا منتہائے مقصود ہے۔

## بحیثیت غزل گو

سعد اللہ شاہ صاحب نے ''موم کے سائبان'' کے دیباچہ میں کہا ہے'' شہناز مزمّل کے ہاں غزل بھی اچھی ہے مگر اس پر بھی نظم کا رنگ غالب ہے، اسے نظم کی شاعرہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا''۔ ''میرے خواب ادھورے'' میں شاہ صاحب نے جو چند سطور تعارفی قلم بند کی ہیں، ان میں شہناز مزمّل صاحبہ کی غزل گوئی کے بارے میں اشارۃً بھی کوئی بات نہیں کی، اس مجموعہ میں غزلیں نظموں پر بھاری ہیں۔ لہذا موصوف کو اپنی پہلی رائے پر اعتماد نہیں رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ شہناز مزمّل غزل کے میدان میں بھی منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کی غزل ایک محدود دائرے میں نہیں گھومتی کہ اوٹ پھیر کر ایک ہی انداز ہو، وہی مضمون اور وہی لفظوں کی تکرار اور وہی مخصوص لہجہ۔ ان کی غزل کا لہجہ امتیازی طور پر نسوانی لب ولہجہ ہے۔ دوسرے ان کے شاعرانہ افکار، ذات کے ساتھ حیات وکائنات کے مسائل کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ ہر مرتبہ سوچ کا انداز مختلف ہے۔ جس طرح فکروشعور کے انداز بدلتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ وبیان کے پیکر بدلتے ہیں، اوپری سطح پر بات کچھ زیادہ مختلف کم نظر آتی ہے لیکن الفاظ کا زیروبست، انداز بیاں کے پیکر، محاکات وتصویر کاری (امیجری) فکروخیال کے نوع بہ نوع نقشے پیش کرتے ہیں۔

شہناز نے اپنی ذات کے علاوہ حیات وکائنات پر مخصوص زاویوں سے نگاہ ڈالی ہے۔ انہوں نے شعر گوئی رسمانہیں کی۔ اپنی بات کو اثر انگیز بنا کر دوسروں تک پہنچانے کی خوبصورت کاوش، ان کا طرہ امتیاز ہے۔

غزل بڑی نازک صنف سخن ہے۔ بظاہر آسان کہ جس کا جی چاہے غزل کہہ لے اور خوش ہولے مگر دراصل یہ ایسا میدان ہے جہاں بڑی مشق و ممارست، زبان و بیان پر قدرت، فکر و خیال کا پھیلاؤ، تراش خراش، لب ولہجہ کی شیرینی، انسانی جذبات کی متنوع کیفیات پر نظر، حقائق کا عمیق تجزیہ، زمانے کی گردشوں کا عرفان، دروں بینی کے ساتھ بیرونی دنیا کا مشاہدہ، غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا انجذاب، یاس و امید کی کشمکش، سوز و گداز، نغمگی، ہر بدصورتی کو خوبصورتی میں بدلنے کی خواہش، یہ سب کچھ، پھر اور بہت کچھ ہو تو غزل بنتی ہے۔ چنانچہ اپنی کامیاب صورت میں ایک انتہائی مشکل آزمائش صنف سخن ہوئی۔ عام طور پر غزل کا ظرف اظہار جستہ جستہ ایک ایک شعر ایک ایک اکائی کی صورت میں ہوتا ہے جس میں مخصوص، کیفیت سوز و ساز اور فکر و خیال کو دلنشین پیرائے میں معنوی وسعتوں کے ساتھ بمصداق: از دل خیز د بر دل ریز د، کامیابی ابلاغ کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس آزمائش کے میدان میں صرف اردو شعراء کی جولا نگاہ ہی ہے جب کہ اب فارسی میں اس صنف پر توجہ کم ہے۔ دوسری زبانوں میں تو صنف ناپید ہے۔

شہناز کی غزل ایک محدود خیال اور ایک محدود انداز بیان کی غزلیں نہیں، اس کا پھیلاؤ اور تہہ در تہہ معانی کا عالم، اس کا مزاج ہے۔ ان کی غزل ہر قسم کی موضوعات، جذبات و خیالات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور اسی مناسبت سے اس کی شعری جمالیات، تصویر کاری اور امیجری ہے۔ اظہار کی ندرت ہے، تشبیہات ہیں، پیکر در پیکر استعارے ہیں، مجاز و مجاز مرسل کی کارفرمائیاں ہیں، الفاظ کا در و بست ہے، بندشیں ہیں، خاموش ضائع بدائع ہیں، سہل ممتنع کی خوبیاں ہیں، شعریت ہے، تغزل ہے، شعریت اور تغزل کے اعتبار سے:

راہ کجلائی ہے کچھ تلخ ایام کے بعد
کیسے گزرے گا سفر آتش ہنگام کے بعد

کس قدر کرب سمیٹے ہیں بدلتی رت نے
کون سمجھے گا یہ دکھ اتنی حسیں شام کے بعد

متاع زیست لٹا کر کوئی ملال نہ تھا
بجز تمہارے کسی کا مجھے خیال نہ تھا

وہ شخص میرا شناسا نہیں تو کون ہے وہ
کسی کو ڈھونڈتے رستہ بھٹک گیا ہوگا

شرار راکھ میں باقی نہیں رہا کوئی
چراغ دل کا مرے جل کے بجھ گیا ہوگا

شبنمی آنکھیں ترے بڑھتے قدم روک نہ لیں
دم رخصت ترا ملنے سے گریزاں ہوتا

ان کو دیکھا جو اچانک تو یہ محسوس ہوا
اس سے پہلے بھی کبھی ان سے ملے ہوں جیسے

پیرہن چاک ہوا گل کا تو رو دی شبنم
سبز موسم کو بھلا ڈھونڈ کے لاؤں کیسے

شہناز طویل مسافتوں کی شاعرہ ہیں، یہ مسافتیں زندگی کے مرحلے بھی ہیں، زمانہ شناسی کے سفر بھی ہیں، کائنات کو سمجھنے کی کاوشیں بھی ہیں۔ ذہنی سفر غلطاں و پیچاں ہے، یہاں شہناز قاری کو اپنے ساتھ سفر کی دعوت بھی دیتی ہیں:

کیوں آج مرا شوق سفر کم نہیں ہوتا

ہر موسم گل عشق کا موسم نہیں ہوتا

رابطہ اپنا زمیں سے ہو سکا کب استوار
اک خلائے بیکراں میں ہم سفر کرتے رہے

اجالوں کی مسافت بھی مقدر میں لکھ دینا
کہ میری خاک کے حصے میں یہ اندھا سفر آیا

میں تھک گئی ہوں قدم میرے اب نہیں اٹھتے
مری طویل مسافت کو مختصر کردے

تھک کر مسافتوں سے بکھرنے لگی ہوں میں
چپ چاپ اپنی آگ میں جلنے لگی ہوں میں

تھیں طویل اتنی مسافتیں کوئی ساتھ میرا نہ دے سکا
وہ یقیں کی حد پر ٹھہر گیا، میں ہر اک گماں سے گزر گئی

ان کی یہ پوری غزل نہایت خوبصورت اور حد درجہ حوصلہ افزا ہے۔ علاوۂ مقصد کے لیے آزمائش سے گزر جانے کی دعوت دیتی ہے۔

تھے عجیب میرے بھی فیصلے، میں کڑی کمال سے گزر گئی
رہے فاصلے میرے منتظر، میں تو جسم وجاں سے گزر گئی

شہناز کی غزلیں بڑی پہلودار ہیں۔ چنانچہ ان کا اظہار و بیاں بھی تہہ در تہہ معنی خیز و پہلو دار ہے۔ ان کی 'انا' انہیں اپنے مقام تفاخر پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ 'انا' وہ جوہر ہے جو جلال و جمال کے ادغام کے ساتھ عرفانِ ذات کو خود اعتمادی کی مسند پر متمکن رکھتا ہے۔ 'انا' کی نفی کے بعد ہر ذات بے سپر دو خاک ہے۔

رابطہ استوار کیسے ہو

خواہشوں پرانا کے پہرے ہیں

ہم اپنی اناؤں کا بھرم رکھتے ہیں

ہر بات پہ طوفان اٹھایا نہیں جاتا

بہت ٹکراتے ہیں اپنی انا کے پتھروں سے ہم

مگر گرتی ہوئی دیوار سے ماتھا نہیں پھوڑا

جس نے بھی جو کچھ کہا چپ چاپ میں نے سن لیا

اک انا تھی درمیاں میں نے کہا کچھ بھی نہیں

ہم اسیران انا تشنہ لب بام گئے

بازی زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے

بکھر کے ٹوٹنے والے صدا نہیں کرتے

کوئی بھی کام خلاف انا نہیں کرتے

شہناز جذب و یقین کی دلدادہ ہیں اور اس کی تلاش و طلب میں سرگرداں ہیں۔

یہ چشم تر مری پتھرا گئی تو کیا ہوگا

یقیں کی آخری حد آگئی تو کیا ہوگا

تلاش جذب میں دنیا تیاگ سکتی ہوں

سکوت دشت سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

بدگمانی سے نکل آئے گماں کی حد پر

بے یقینی کی فضا آج مٹا دی ہم نے

'جاناں' کیونکہ شہناز کا درون ذات متحرک عکس ہے۔ لہذا اس حوالے سے انہوں نے بڑے اچھے اشعار کہے ہیں۔

یہ تیرے ساتھ لفظوں نے بھی کیوں چپ سادھ لی جاناں
ادھر آ لفظ کی دہلیز سے مل کر گزر جائیں
دل کا سناٹا مری روح میں اترا جاناں
ضبط گریہ سے مری جان پہ بن آئی ہے
ڈھونڈنے نکلی تھی میں درد کا درماں جاناں
راستہ پایا ہر اک شعلہ بداماں جاناں
عمر گزری ہے مری عرصہ تنہائی میں
اور سہہ سکتی نہیں وحشت زنداں جاناں

ناشناسائی کا احساس، ہر گھڑی امتحان کا خوف، محرومی، اضطراب، رتجگے، بے بسی، خود سے فرار، حسرت، کسمپرسی، حیرت، جستجو، نارسائی کی تھکن، خوابوں کی سیر، ندرت اظہار و بیاں، کیا کیا نہ کیفیات اور مناظر ان کی غزل کا دامن سمیٹے ہوئے ہے۔ ملاحظہ ہو:

ناشناسی کے کئی زاویے بنتے دیکھے
ہمنوا کس کو زمانے میں بنایا جائے
گردش دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں
واہمے کے جنگلوں میں گم ہوئیں پرچھائیاں
شب کے سناٹے میں ہم سائے سے بھی ڈرتے رہے

آنکھوں میں چھپے خواب بھی چھن جائیں نہ مجھ سے
اس خوف سے روزن کوئی کھولا نہیں جاتا

آنکھ کھلتی بھی نہیں اور آنکھ لگتی بھی نہیں
ضبط گریہ ہے مگر صدمات ہی کچھ اور ہیں

دشت حیرت سے بہت دور نکلی آئی ہوں
اب پلٹ جانے کی تدبیر نہیں بنتی ہے

اف یہ نیرنگی دوراں یہ تمنا کے سراب
دشت حیرت میں بھٹکنے کی سزا پائی ہے

سیاہ شب میں ڈسے جب بھی کرب تنہائی
چراغ یاد کے دل میں جلا لیا کرنا

میرا ہر خواب ادھورا کوئی تعبیر نہیں
عکس کیسا سرِ دیوار سجایا جائے

ظلمتِ شب سے کہو ذرا اپنی ردا سمیٹ لے
دل کا دیا تو شام سے میں نے بجھا دیا ہے آج

لہجے کی نسوانیت شہناز کو منفرد مقام عطا کرتی ہے، کسی شاعرہ کا شعر کہنا، مخصوص موضوعات کو اپنانا الگ بات ہے جبکہ ادائیگی میں لہجے کا دھیمہ پن، لہجہ کی عصمت و دوشیزہ گی، ملائمت و شیرینی، ایک ایسی خوبی ہے جو نسائیت کے شعوری احساس کے بغیر نہیں ملتی۔

کون جانے وہ حسین تھا کہ تمنا میری
ڈھونڈ لائی تھی کہیں سے مری رسوائی کو

اپنے چہرے پہ کوئی چہرہ سجائے رکھنا
جذبہ شوق میں اچھا نہیں ارزاں ہونا

وہ اپنی اور میری زندگی کے درمیاں اکثر
اٹھا رکھتا ہے اک دیوار در ہونے نہیں دیتا

شہناز کی غزل امیجری یعنی تصویر کاری، اتنی زبردست، متنوع، دلکش اور تہہ در تہہ معری دار ہے کہ اور کہیں کم ملے گی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے مضامین غزل نوع در نوع اور بسیط مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ اسی لحاظ سے الفاظ وتراکیب اور اظہار و بیان کا تار و پود ہے۔ یہاں جنگل ہیں، سیلاب ہیں، کشتیاں ہیں، سمندر ہیں، صحرا ہیں، ہواؤں کے رخ ہیں، کھلی فضائیں ہیں۔ پتھر آئینوں کے مقابل ہیں۔ موسموں کی رتیں ہیں، شفق ہے، صبح شام کے مناظر ہیں، دیوار ہے، روزن دیوار ہیں، دریچے ہیں، جذبات ہیں، احساسات ہیں، موانست ہے۔ بیزاری ہے، بےکلی ہے، آرزوئیں ہیں، تمنائیں ہیں، خلوص ومحبت ہے، الغرض بیرونی اور اندرونی دنیا کا سب کچھ ان کی غزل اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

بازاروں چوراہوں میں اک بھیڑ لگی ہے لوگوں کی
ہوش وخرد سے بیگانے ان انسانوں میں کھو جاؤ

میں چنار اور جنگل رات بھر اکیلے تھے
چاند کے سلگنے کا بھید پانے ٹھہرے تھے

کرچیاں سی بکھری تھیں ہر طرف فضاؤں میں
پتھروں کے شہروں میں آئینوں کے میلے تھے

پتھروں کی بستی میں آئینے اٹھا لائی
کانچ کانچ جذبوں کی نازکی سے ڈرتی ہوں

گہرے تیز پانی سے کشتیاں سجانے کو
ساحلوں پہ موجوں نے کیا عذاب جھیلے تھے

بلا کی آندھیوں کا سامنا اکثر رہا لیکن
سیئے ہیں بادباں ہم نے ہوا سے رخ نہیں موڑا

نہ سمندروں سا مزاج تھا نہ فضاؤں جیسی تھیں وسعتیں
تو ہوا کے رخ پہ چراغ کیوں شب تار سارے جلا دیئے

دھوپ کی چادر اوڑھ کے سر پہ چلتی ہوں
اپنی آگ میں تنہا خود ہی جلتی ہوں

زندگی کی گتھیاں سلجھانے کے لیے شہناز ہر طرح کوشاں ہیں۔ یہ گتھیاں انہیں دائرہ در دائرہ نظر آتی ہیں۔ حقائق کی آگہی جان لیوا ہے، زندگی کی ناپائیداری کا خیال حوصلہ شکن ہے، وقت کم ہے اور کام بہت۔ آرزوئیں ہیں، تمنائیں ہیں، زندگی اور اس بے ثبات دنیا کو خوبصورت بنانے کے کیا کیا خواب ہیں اور ان کی تعبیر کی تلاش ان افکار کو کتنے حسین پیرایوں میں ادا کیا ہے۔

دائروں کے درمیاں گردش میں اک مدت سے ہوں
زندگی میری تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں

گرد گرد چہرہ ہے وحشتوں کے ڈیرے ہیں
تھک گئی ہوں کتنا میں دائروں میں چلنے سے

اب شہر آرزو کے منظر بدل گئے ہیں
رستے بدل گئے ہیں رہبر بدل گئے ہیں

اس کڑی دھوپ میں جلتا ہے سراپا شہناز
ابرِ باراں نہ سہی سایہ دیوار تو ہو

زندگی سے کیا ڈرنا آگہی سے ڈرتی ہوں
تیرگی کے موسم میں روشنی سے ڈرتی ہوں

بساط اپنی سمیٹو کہ وقت رخصت ہے
ہیں چند لمحے فقط یاد رفتگاں کے لیے

شبنمی آنکھیں مری تعبیر سے ڈرتی رہیں
جل بجھے تھے خواب سارے اور بچا کچھ بھی نہیں

کھلے دریچوں پہ دستک ہوا نہیں دیتی
سماعتوں پہ کبھی اعتبار مت کر

کھلے دریچے ہیں سارے ہواؤں کی زد میں
میں کس مکان کی کس بام ودر کی بات کروں

اس ضمن میں اگر میں شہناز صاحبہ کی توجہ میر کے اس شعر طرف مبذول کراؤں تو بے جا نہ ہوگا۔ شاید اس سے ان کے مجاہدانہ اضطراب میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہو، حقیقت پسندی تصوریت سے ہم آہنگ ہوکر سامان تسکین بن سکے۔

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر
میں گرچہ سرد و گرم زمانہ سمو گیا

چھوٹی بحروں میں شہناز کی غزلیں لاجواب ہیں۔ شاعری کیا ہے۔ افسوس گری ہے، پوری پوری غزلیں سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں، نغمگی اور کیفیت سے معمور ہیں۔ نشتریت پیوست ہے۔ سہل ممتنع عام ہے:

لاش اپنی اٹھا کے چلنا تو
ہمسفر بار بار مشکل ہے

کون جانے وہ پھر پلٹ آئے
آخر شب دیا جلا رکھنا

بہا رہا ہے مرا دل تو خون کے آنسو
خدا کا شکر مری آنکھ اشکبار نہیں

آخری حد کہیں یقیں کی نہیں
اس لیے میں گماں میں رہتی ہوں

بہت سے سپنے ہیں نامکمل
میں رتجگوں سے فرار چاہوں

ذہن دریچے بند نہ کرنا
شاید اگلی پروا آئے

شہناز صاحبہ کے ہاں ندرت خیال واظہار نے متعدد نادر تراکیب تراشائی ہیں۔ مثلاً:
'خواہش سربریدہ'، 'سکوت منجمد'، 'ہجوم بیکراں'، 'نیم جاں سرگوشیاں'، 'ناقوس مسیحائی'، 'دشت حیراں'، 'دل دریدہ'، 'رخ فکر'، 'عکس دیوار'، 'زردی اصنام'، 'زردرت'، 'سبز موسم'، وغیرہ۔

حمد ونعت:

شہناز صاحبہ کا حمد ونعت میں بھی منفرد مقام ہے۔ یہاں بھی روایتی انداز نہیں۔ جو کیفیت دل میں ہے وہی مطابقت رکھتے ہوئے الفاظ میں زبان پر بصورتِ اشعار ہے:

نہ کن کہا تھا جو تو نے زمان میرے تھے
یہ آسماں یہ زمیں سب مکان میرے تھے
اے لامکاں کے مکیں تو ہے ہر جگہ موجود
شہود وشاہد ومشہور صرف تو مسجود

نعت

قرآن وہ بیاض حقیقت دکھائی دے
لفظوں میں جس کے آپ کی سیرت دکھائی دے
ترس رہی ہوں میں انوار صبح رحمت کو
درود نور سحر میرے نام کر دینا
مہ و خورشید نہ تاروں سا مقدر مانگوں

کعبہ و جنت حرم اور ترا در مانگوں
مجھ میں کہاں ہے جرات توصیف مصطفیٰ
یہ تو کرم ہے اس کا ملی حرف کو صدا

شہناز صاحبہ کی شاعری کے جملہ محاسن شعری 'تنوع' جمالیات، امیجری، وسعت فکر وفلسفہ وغیرہ کے تناظر میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اردو شاعری میں بحیثیت شاعرہ منفرد مقام کی حامل ہیں اور صف اول کی شاعرات میں امتیازی شان رکھتی ہیں۔
(مضمون سے غیر متعلق یہ شعر بطور خراج تحسین ان کی نذر ہے)

ہاں! شاعرۂ عصر بتا کون ہے اے
آواز وہیں آئی کہ شہناز مزمل

# کلثوم برنی

## اسلامیہ کالج کوپر روڈ

شہناز مزمّل اردو شاعری میں جانا پہچانا نام ہے۔ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ میڈیا جیسے اٹھا دے وہ ایک نام ہے اور جیسے نہ پوچھے وہ بے نام ہے۔ میڈیا نے کئی چھوٹے چھوٹے شاعروں کو بڑا نام دیا۔ اور کئی شہناز مزمّل جیسے خوبصورت ودلکش لکھنے والے مخصوص کونوں میں چھپ گے۔ پھر بھی اپنا کام کرتے رہے۔ اور آگے بڑھتے رہے۔

جذبوں کی آنچ سے قطرہ قطرہ پگھلتی ''مصرع لرزاں'' کی طرح اس شاعرہ نے ''جذب وحروف'' کے بعد ''جراتِ اظہار'' اور پھر ''عکس دیوار پہ تصویر'' بنا کر بھی ''میرے خواب ادھورے ہیں'' کا شعری سفر تیزی سے طے کیا۔ ''جادہ عرفاں'' ہو یا ''موم کے سائباں'' یا پھر ''پیامِ نو'' شہناز مزمّل اپنے سفر کو رواں رکھے ہوئے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ شعر سے کچھ مالی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اگر زہین کی تیزی، دل کی شگفتگی، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کا شمار فائدوں میں ہے تو پھر شعر وشاعری کے مفید ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے۔ سوتے احساس کو جگاتی ہے۔ مردہ جذبات کو جلاتی ہے۔ اور حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ ڈاکٹر شہناز مزمّل اپنی فلسفیانہ سوچ، متنوع مضامین کے ساتھ ایک اچھوتا آہنگ لئے شاعری کی نرم ونازک دنیا میں داخل

ہوئیں۔ وہ ایک بالغ نظر شاعرہ کی حیثیت سے ذاتی اسلوب کی ایجاد کردہ ہیں۔

کسی بھی شاعر کو نظم گو یا غزل گو کے خانوں میں تقسیم کرنا زیادتی ہے۔ مگر کسی بھی شاعر کے کلام میں غزل اور نظم کی بنیادی خصوصیات کو پرکھنا اس کے کلام کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔

بنیادی طور پر شہناز مزمل کسی خاص طبقے یا کسی خاص صنف سخن کی شاعرہ نہیں ہیں۔ وہ نظم ہو یا غزل رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ شہناز مزمل کی غزل حساس انگلیوں سے ہواؤں اور فضاؤں کے کرب لطافت اور نزاکتوں کو محسوس کرتی ہے۔ غزل کی ہیئت کے مخصوص تقاضے اور شاعر کے طبیعت میں فطری ہم آہنگی نہ ہو۔ اسوقت تک غزل گوئی کے منصب سے عہدہ برآہ ہونا ممکن نہیں غزل اندر سے باہر تک ہر چیز کی ترجمانی کرتی ہے۔ تو دوسری طرف وضاحت اور تشریح کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ غزل کی سادگی کی طرف ہر شاعر لپکتا ہے۔ مگر غزل مشاہدات و تجربات کی صداقت کے ساتھ شاعر سے ایک مخصوص فنی اظہار کا مطالبہ کرتی ہے۔

رومان اور حقیقت کا امتزاج، احساس کی شدت، جذبات کا خلوص، چھوٹی بحر، انداز بیان کا نیکھا پن، موسیقیت، فنکاری یہ تمام شعری خصوصیات شہناز مزمل کی غزل میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شہناز مزمل وارداتِ عشق کو بیان کرتی، ہجر و وصال کا قصہ چھیڑتی، جذبہ عشق میں خود اعتمادی کی ترجمانی کرتی ہے۔

مجھے بھی کچا گھڑا ملا ہے
اترنا دریا کے پار چاہوں
بہت سے سپنے ہیں نامکمل
میں رتجگوں سے فرار چاہوں
نہ ہو کے محدود رہ سکوں گی
میں وسعتِ بے کنار چاہوں

(موم کے سائباں، نمبر)

جذبہ عشق میں خود اعتمادی سے آگے بڑھتی شہناز مزمل گماں کی حدوں سے نکل کر منزلوں کے نشانوں کی طرف بڑھتی ہیں۔

آخری حد کیوں یقیں کی نہیں
اس لئے میں گماں میں رہتی ہوں
خود کو پانا نہیں ہے ناممکن
منزلوں کے نشاں میں رہتی ہوں

(موم کے سائباں، ص نمبر 190)

یہ چشم تر مری پتھرا گئی تو کیا ہوگا
یقیں کی آخری حد آ گئی تو کیا ہوگا

اس طرح ایک اور جگہ یوں فرماتی ہیں۔

اتنا احساس ندامت نہ دلایا جائے
فیصلہ جرم کا اک بار سنایا جائے
ہے ابھی پیش نظر کوئی سہانا سپنا
آتشِ دل کو ابھی اور بچایا جائے

(موم کے سائباں، ص نمبر 154-153)

شہناز مزمل کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ غم والم اور یاس وحسرت پر مبنی اشعار کی فراوانی کے باوجود ان کے کلام میں زندگی کی تڑپ، اُس سے محبت ہے۔

چلتے چلتے کبھی مل جائے گی منزل مجھ کو
گرتے گرتے میں کسی روز سنبھل جاؤں گی

چاند کے روپ میں سو بار مرے سامنے آ
کوئی ناداں نہیں ہوں کہ مچل جاؤں گی
(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 37)

وہ ہجر میں بھی حسین خواب دیکھتی اور دکھاتی ہیں۔

چاند خوابوں کے ڈھل رہے ہوں گے
خواب آنکھوں میں پل رہے ہوں گے
ٹوٹتی ہے یہ سرد خاموشی
برف موسم پگھل رہے ہوں گے
(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 21)

شہناز مزمل کی ہم عصر شاعرات کی شاعری میں فکر و فلسفہ کم ہے۔ شہناز مزمل اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ کہ ان کے ہاں فلسفیانہ رجحان غالب رجحان کے طور پر نظر آتا ہے۔

جنوں کے دور میں خود سے بھی رابطہ کب تھا
کبھی زمانے سے کچھ بھی کہا سنا کب تھا
ہجوم فکر کی تجسیم کس طرح ہوتی
نظر کے سامنے منظر کوئی بنا کب تھا

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 39)

اسی طرح فرماتی ہیں۔

بڑی خموشی سے آکر زمیں پر گرتے ہیں
فلک سے ٹوٹتے تارے صدا نہیں کرتے

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 57)

شہناز مزمّل کی ہر غزل میں انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کی غزل میں جو میلانات ملتے ہیں۔ وہ کسی بھی شاعر کیلئے نئے نہیں۔ مگر شہناز مزمّل فنی پابندیوں کے باوجود دل و جاں سے غزل میں نئی روح پھونکتی ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں کے موضوعات حسن و عشق کے گرد زیادہ گھوم رہے ہیں۔ مگر وہ حسن و عشق کی ہر کڑی ہر راز سے پردہ اٹھا دینا چاہتی ہیں۔

ڈھونڈنے نکلی تھی میں درد کے درماں جاناں
راستہ پایا ہر اک شعلہ بداماں جاناں
عمر گزری ہے مری عرصہ تنہائی میں
اور سہہ سکتی نہیں وحشتِ زنداں جاناں

(موم کے سائباں، ص نمبر 161)

غزل ہمہ گیر زندگی کی عطاس ہوتی ہے۔ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے ہوئے اوفانی طرز کو سات لے کر ہی غزل گوئی میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شہناز مزمّل کی غزلیں اوفانی طرز احساس ہی کی ترجمان نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی غزلوں میں موسقیت کی ایک دنیا سمٹ گئی ہے۔ وزن اور طور کی پابندیوں کے باوجود ان کی غزلوں میں موسیقی کا ہر آہنگ رچا ہوا ہے۔

اس حقیقت کا مرے دوست اقرار مجھے
میں گنہ گارِ وفا ہوں نہیں انکار مجھے
میرا مذہب ہے محبت، مرا شرب ہے وفا
دشمنوں سے بھی ہے اپنوں کی طرح پیار مجھے

(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 52)

شہناز مزمّل کی غزلوں میں بے ساختگی اور جذبے میں سوز و گداز ہے۔ ان انسانی

خوبیوں نے ان کی غزلوں میں آہنگ کے نئے تجربے شامل ہیں۔

میں پر بریدہ ہوں کیسے سفر کی بات کروں
ڈسا ہے شب نے میں کیسے سحر کی بات کروں
میں اپنے جذب کو الفاظ دے نہیں سکتی
تو کیوں میں تجھ سے کسی نامہ بر کی بات کروں

(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر۔۔۔۔)

غزل کی ایک بڑی خوبی سہل ممتنع کو کہا جاتا ہے۔شہناز مزمّل کی غزلیات میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔سادگی اور حسن یہاں کی وہ صورت جو بظاہر آسان معلوم ہو۔اس کا نبھانا مشکل ہو۔شہناز مزمّل کے ہاں مصرعوں کو اگر بول چال کی نثر میں تبدیل کردیں۔تو ترتیب الفاظ میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔

مات سے پہلے بات بنائی جاسکتی تھی
نفرت کی دیوار گرائی جاسکتی تھی
موجوں کا پیغام نہ سمجھا ساحل نے
ورنہ ڈوبتی ناؤ بچائی جاسکتی تھی

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 61)

اس طرح سہل ممتنع کی مثالیں ''عکس دیوار پہ تصویر'' میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

کوئی مجھے آ کر سمجھا ہے
میں نے بھی تھے خواب سجائے

رستہ خود سر اپنا ٹھہرا

منزل سے بھی آگے جائے

آنسوں کے کچھ دیپ جلا کر

باقی سارے دیپ بجھائے

(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 57)

اس طرح ایک اور جگہ خوبصورت نثر میں شاعری کے بند باندھ دیئے ہیں۔

اب شہر آرزو کے منظر بدل گے ہیں

رتے بدل گئے ہیں رہبر بدل گئے ہیں

یہ شہر تو ہے میرا آنکھیں ہیں اجنبی ہیں

چہرے بدل گئے ہیں یا گھر بدل گئے ہیں

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 51)

شہناز مزمّل کے ہاں چھوٹی بحر کی خوبصورتی بہت جگہ نمایاں ہے۔ وہ چھوٹی بحر کو استعمال کرتے ہوئے خوبصورت اشعار صفحہ قرطاس پر بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔

زندگی کا حصار مشکل ہے

موت کا انتظار مشکل ہے

لاش اپنی اٹھا کے چلنا تو

ہمسفر بار بار مشکل ہے

آنکھ شاید کبھی لگی ہو گی

رتجگوں کا شمار مشکل ہے

(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 30)

چھوٹی بحر کو استعمال کرتے ہوئے متنوع موضوعات کو چھیڑتی ہیں۔

اپنے ہی آپ کو بھلا رکھنا
یہ رویہ سدا روا رکھنا
بھید دل کا نہ کھول دیں آنکھیں
چلمنوں کو ذرا گرا رکھنا
زندگی نام ہے تسلسل کا
منزلوں تک یہ سلسلہ رکھنا

(عکس دیوار پہ تصویر، ص نمبر 40-39)

شہناز مزمل کے ہاں ہجر و وصال میں بھی امید، رجائیت اور آنے والے اچھے دنوں کی نوید ہے۔ وہ ہر دم نئی سحر کی منتظر ہیں۔

ظلمتوں کے چہرے سے آئینے ہٹا ڈالو
روشنی تو ہو گی کچھ جگنوؤں کے جلنے سے

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 26)

اس طرح ایک جگہ یوں پر امید ہیں
ایک مانوس سی خوشبو ہے فضا میں افشاں
ہجر موسم میں کبھی پھول کھلے ہوں جیسے

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 27)

شہناز مزمل کی غزل اپنے اردگرد کے ماحول کی بہترین عکاسی ہے۔ وہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے موضوعات کو اشعار کے سانچے میں خوبصورتی ڈھالتی ہیں۔

یہاں پر غاصبوں اورخود پرستوں نے کیا قبضہ
مٹا کر یہ جہاں دنیا نئی تعمیر کرتے ہیں

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 33)

اسی طرح

دام بچھائے کنج قفس میں بیٹھے ہیں صیاد یہاں
زنجیریں حلقہ بنتی ہیں زندانوں میں کھو جاؤ

(موم کے سائباں، ص نمبر 165)

شہناز مزمل کے کلام میں ان کی نظم بھی پورے قد کے ساتھ غزل کے برابر کھڑی ہے۔ ''موم کے سائباں'' کی نظمیں اپنے اندر ایک نئی دنیا کی تسخیر کا معاہدہ لے کر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ہاتھ ایسا کونسا اب آئے گا
زخم پر مرہم مرے رکھ جائے گا
اے دریدہ وانی مجھ کو بتا
کسقدر باقی ہے اب میری سزا

(''مجموعہ کلام موم کے سائباں'' جرم آگہی، ص نمبر 30)

اس طرح ذرا آگے چلتے ہیں۔

اس کی روشنی کی لو کو لے کر
وہ نکلتے ہیں
اندھیری راہ چلتے ہیں
یہ سورج جل تو سکتا ہے
یہ سورج مر نہیں سکتا

(موم کے سائباں، ابھی سورج کو جلنا ہے، ص نمبر 32)

نظموں میں بھی اپنے خوابوں کو اجالا پھیلاتی ہیں۔

دھکتے لمحے جواب ہوں گے
مری تمنا کا جستجو کا
مری ہتھیلی پہ خواب ہوں گے

(مری ہتھیلی پر خواب دینا، موم کے سائباں، ص نمبر 33)

شہناز مزمل غزل گو کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ''لاحاصلی کی سرزمین ہو'' 'باکڑی سزا'، 'رتجگوں کی مسافت' ہو یا ''برزخ احساس'' وہ اپنے خوابوں کی تجسیم چاہتی ہیں۔ کہیں بیزاری نہیں۔ اکتاہٹ نہیں، ناامیدی نہیں اک جوش، ولولہ اور ایک بے قراری ہے۔ زندگی سے فرار ضرور ہے۔ مگر اس فرار میں بھی بے چینی اور ولولہ ہے۔

مٹی کے کھلونے راہ میں بکھرے پڑے ہوں
کبھی شکوہ نہیں ہوتا
کبھی ماتم نہیں ہوتا

یہ کیسا رتجگا ہے
یہ بے خوابی سی کیسی
آج آنکھوں میں اترتی ہے
کہ یہ دکھتا بدن
اکھڑتی سانس کہتی ہے
کوئی خواب حسین ہی بھیک میں مجھ کو بھی دے دے
وگرنہ اے خدا یہ زندگی لے لے

(''موم کے سائباں''، رتجگوں کی مسافت، ص نمبر 20)

موم کے سائباں آزاد شکل میں سامنے ہیں۔

خدایا
برف سوچوں کو مری پگھلا
نیا سورج جلا کر
میری یخ بستہ سی سوچوں کو روانی دے
مرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

(سرد سناٹا، ص نمبر 55)

شہناز مزمل کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر مستقبل طور پر ن۔م۔راشد کے مختلف نظمیں رہیں۔راشد اردو نظم کی ابتداء میں۔اور شہناز مزمل ان کی پیروکار کی حیثیت سے نظم کی انگلی تھامے اسے آگے بڑھانے کے لئے برسرِ پیکار ہیں۔

شہناز مزمل کے ہاں خواب ٹوٹنے اور بکھیرنے کا عمل بہت خوبصورت طریقے سے

سامنے آتا ہے۔ ''موم کے سائباں'' کی شاعرہ مستقل خواب دیکھ رہی ہے۔ اور دیکھنا چاہتی ہے۔

بہت زمانے سے ہے آنکھ منتظر میری
نہ جانے کتنے دنوں سے پلک نہ جھپکی
نظر سے ٹوٹ گئے سارے خواب کے رشتے
سماعتیں ہیں مری کب سے گوش بر آواز

شہناز مزمل کی نظموں میں خواب اور پھر آنکھ استعارہ ہیں۔ شہناز مزمل مستقبل کے خواب دیکھتی، مٹی سے رستہ جوڑتی آگے بڑھنا چاہتی ہیں۔

مٹی یہ بھی
مٹی میں بھی
کیوں نہ اب دور کی سوچوں
مٹی کھاؤں مٹی پیوں
اور مٹی ہو جاؤں (مٹی، ص نمبر 43)

وہ اپنے وجود کو منوانا چاہتی ہیں۔ نظم گو کی حیثیت سے شہناز مزمل آزاد نظم کے بانی ن۔م۔ راشد سے بہت متاثر نظر آتی ہیں۔ کبھی بے بسی، کبھی خود اعتماد، خود مختار، خیالات کی دوڑ میں آگے اور آگے نکلتی شہناز پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی۔

کون بتلائے گا تفسیر محبت کیا ہے
کون بتلائے گا تکمیل محبت کیا ہے
کون سمجھائے گا دنیا کی حقیقت مجھ کو

کس طرح تشنہ لبی کم مری ہوگی ساقی

(عکس دیوار پہ تصویر، تشنہ لبی، ص نمبر 111)

ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

مجھے سکون چاہیے
مجھے وہ چند سانس دے
کہ میں خود اپنے آپ سے
لپٹ کے رُو سکوں ذرا

(شکستہ آئینے، ص نمبر 20)

آزاد نظم کے خوبصورت تجربے شہناز کی شاعری میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ہیئت کی تبدیلیوں اور لفظ کے تخلیقی استعمال کے علاوہ شہناز کا مخصوص لہجہ ان کی انفرادیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ شہناز مزمّل کے ہاں یہ نہیں۔ کہ کٹی پھٹی تخلیقات کو نیا ڈیزائن عطا کر دیا۔ ان کے ہاں امتیازی وصف مجموعی علامتی ہے۔ نظم میں وہ کسی مقرر اَنی کو پہنچانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ لفظ کی دیواروں کو ذات کے پھیلاؤ پر یقین رکھتی ہیں۔ بحر اور وزن کی پابندی کے باوجود ان کے خیالات کہیں منقطع نہیں ہوتے۔ شہناز مزمّل نظم میں داخلیت سے نکلتی اور عصری مسائل کا ذکر کرتیں کبھی راشد اور کبھی سردار جعفری کی پیروکار نظر آتی ہیں۔

شہناز مزمّل اپنی نظموں گردش ایام سے ''ندائے خیر'' کی خواہاں ہیں۔

گردش ایام کی زنبیل میں
شاید کوئی لمحہ بچا ہو
جس پہ میرا نام لکھا رکھا ہو

میرے کاتب تقدیر نے

اور پھر وہ ساعت خفتہ مجھے

بس ندائے خیر دے

(ص نمبر 74، ندائے خیر)

وہ اپنے خیالات میں گنگناتی ہیں۔

زندگی کا بھی فلسفہ ہے عجیب

کچھ کسی کو سمجھ نہیں آتا

سانس چلتی ہے زندہ رہتے ہیں

سانس لینا بھی ایک عادت ہے

زندہ رہتے ہیں زندگی کے کیلئے

زندہ رہنا بھی اک روایت ہے

(زندہ رہنا اک روایت ہے، ص نمبر 81)

انیس ناگی لکھتے ہیں۔

''ان کی نظمیں خود آگہی کا سفر ہیں۔ وہ اپنی نظموں کے ذریعے اپنی محصور ذات کو دریافت کرتی ہیں۔ یہ دریافت روحانی اور مابعد ازطبعاتی نہیں۔ ارضی اور حقیقی ہے۔ شہناز مزمل کی نظمیں جو جذباتی سطح مرتب کرتی ہیں۔ ان میں معاصر ناہموار زندگی کی رنگت اور فرد کی ازلی مجبوری کا عکس دکھائی دیتا ہے''

(موم کے سائباں، انیس ناگی)

ہمارے ہاں ایسے شعراء کی کمی نہیں۔ جو پابند نظموں کے ساتھ مصری اور آزاد نظمیں بھی

لکھتے ہیں۔ شہناز مزمل نے آزاد نظموں میں بھی لچک پیدا کی ہے۔ اور اس کے امکانات کو وسیع تر کیا ہے۔ بطور نظم گو رومان پسند نہیں۔ بہت تلخ حقیقتوں کا انکشاف پڑھنے والے کے تجربوں میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر کے پس منظر اور معاشرے کی بے حسی کے پیش منظر میں شاعری کرتی ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کی پیروکار کی حیثیت سے زندگی کا وسیع مشاہدہ ان کے کام آتا ہے۔

ہنگام سحر کی بات نہ کر سب کچھ ہے یہاں زرداروں کا
روداد شب غم کیسے کیوں رکھنا ہے بھرم پنداروں کا
شعلے ہیں فضاؤں میں رقصاں کلیوں کی گریہ زاری ہے
احساس مروت گرد ہوا اک خوف سا مجھ پر طاری ہے
بے بام ودر کے باسی تو سپنوں کے جھروکوں سے اکثر
کبھی برج منارے دیکھتے ہیں کبھی محل دوارے دیکھتے ہیں
سب تلخ حقیقت جانتے ہیں اوقات بھی سب پہچانتے ہیں
خوشیوں پر سب کا حق تو ہے اور حق اپنا مانگتے ہیں

(میرے خواب ادھورے ہیں، نظم، رکھنا ہے بھرم پنداروں کا، ص نمبر 100)

شہناز مزمل کے اندر سچائی اور بے ساختہ پن ان کی غزلوں میں اسطرح وارد ہوا ہے۔ کہ زندگی سے متعلق ان کے تمام نظریات اور خیاالات کی کڑواہٹ ان کے جذبات کی چبھن ان کے ہاں آگہی کا استعارہ لئے وارد ہوئی ہے۔

زندگی سے کیا ڈرنا آگہی سے ڈرتی ہوں
تیرگی کے موسم میں روشنی سے ڈرتی ہوں
پتھروں کی بستی میں آئینے اٹھا لائی

(میرے خواب ادھورے ہیں، ص نمبر 43)

یونس جاوید ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''شہناز مزمل ذات کا کرب ہو، ذات کی قید ہو یا بندگلی کا بندھن، شہناز کے ہاں زندگی گزرانے کی خواہش کہیں بھی دم توڑتی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ محرومی، بے بسی، اور فرار کے جنتے لمحوں نے اسے عذاب سہنے کا حوصلہ دیا ہے۔''

(عکس خیال۔ علامتوں کے آبگینے، یونس جاوید)

شہناز مزمل اپنی نظموں میں خودمختاری کی آرزو کرتے ہوئے خودشناسی کے آدرش کو اپنانے کا حوصلہ دکھاتی ہیں۔ وہ آگہی کے عذاب سے اور محبت کی پرچھائیں سے راستہ بناتی ہیں۔ وہ انسان کی بے چہرگی اور عدم تشخص پر افسردہ ہیں۔ وہ معاشرے کی موجودہ حالت میں تبدیلی کی خواہاں ہیں۔ وہ راستے کے پتھر چنتی اور راہوں کو ہموار کرتی چلی جاتی ہیں۔

فضائیں دھند میں لپٹی ہوئی ہیں
تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر کھولنا ہوں گے
تجھے در کھولنا ہوں گے
فضاؤں میں بکھیرتی ریت
آنکھوں میں اتر جائے
ہواؤں کے بگولے بھی حصار راہ بن جائیں
فضائیں پھیلتی یہ دھند

تاروں کی کوئی ننھی کرن باہر نہ آنے دے
اجالے بخشنے والا مسیحا کھو گیا ہو
تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر تولنا ہوں گے
تجھے در کھولنا ہوں گے

(نظم۔ تجھے پر کھولنا ہوں گے، موم کے سائباں، ص نمبر 76)

شہناز مزمّل نے عصرِ نو کے رویوں کو، ان کے تقاضوں کو، جس سادگی، پاکیزگی اور روانی سے شاعری میں سمویا ہے۔ اور جس نئے آہنگ سے پرانی روایات کے ساتھ وادی شعر و سخن میں داخل ہوتی ہیں۔ بجا طور پر انھیں نئی صدی کی شاعرہ کہا جا سکتا ہے۔ جب بھی اردو شاعری میں خواتین شاعرات کا ذکر ہو گا۔ ان میں ایک نمایاں نام شہناز مزمّل کا ہو گا۔

# شہناز مزمّل ایک ہمہ جہت شخصیت

میرے شوہر سیّد یوسف سردار کو ایک عرصے سے ایک ایسے معزز ادارہ کی جستجو تھی جہاں ہم جیسی خواتین اپنی کاوش کا اظہار کر سکیں۔ اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ میرے شوہر کے ایک دوست افضل باقی صاحب جو خود بہت اچھے شاعر اور بہت شریف انسان ہیں جن کی بیٹی سعدیہ ردا بھی جو اس کم عمری میں بہت پختہ اور خوبصورت اشعار کہتی ہیں۔ ہمارے گھر تشریف لائے افضل باقی صاحب نے بتایا کہ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی انچارج محترمہ شہناز مزمّل صاحبہ ہر مہینے کی دوسری پیر کو ماڈل ٹاؤن لائبریری میں ہی ''ادب سرائے'' کے نام سے ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہیں۔ شہناز مزمّل صاحبہ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی نہ صرف انچارج ہیں بلکہ لائبریری نوزائیدہ تھی تو محترمہ نے اس کو ماں کی طرح نگہداشت کر کے پروان چڑھایا ہے ماڈل ٹاؤن اور اس کے گردنواح کے علم و ادب کے بہت سے تشنہ کام یہاں سے شاد کام ہو کے جاتے ہیں۔ علمی اور ادبی موضوعات پر سلیقے اور ترتیب سے سجی کتابیں لان میں پھولوں کی سجی کیاریاں اور دیواروں پر نفاست سے چڑھی سرسبز بیلاوں کے علاوہ کام میں منہمک اور لگن، خوش اخلاق اسٹاف محترمہ شہناز مزمّل کی انتظامی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے میں جب کتابوں کی دنیا۔ سے ہوتی ہوئی ان کے آفس میں داخل ہوئی تو انھیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک بہت خوبصورت اور معتبر کتاب میرے سامنے آ گئی ہو۔ روشن آنکھوں پاکیزہ چہرہ کی یہ خاتون نہ صرف ایک سرکاری افسر ہیں بلکہ ایک منفرد شاعرہ نگار اور نثر نگار بھی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کتابوں سے انھیں لوگوں کو محبت ہوتی ہے۔ جن کے دل کا ہر ورق ادب و علم کا امین ہوتا ہے۔ میں بھی کتابوں کی ایک ادنیٰ سے پرستار ہوں اس

لیے دل نے چاہا کہ شہناز مزمل صاحبہ کے ادبی سفر کے پیچ وخم کا حال بعد اصرار ان سے سنا جائے تا کہ اس دشتِ فاراں کے ہم جیسے ساغروں کو ایک روشن سنگِ میل میسر آ سکے تو جب انہوں نے بتایا کہ انکو اس مقام تک لانے میں ان کے شوہر جناب سلطان صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو یہ بات میرے لئے بڑی ہی حیرت انگیز خوشی کا سبب بنی کیونکہ عام طور سے شوہر حضرات میں ایسی مثالیں خاصی کمیاب ہیں محترمہ نے بتایا کہ ان کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی ابھی جبکہ انہوں نے میٹرک ہی پاس کیا تھا۔ چونکہ وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہیں۔ اس لئے ماں باپ اور بھائیوں سب کے چاؤ اور ارمان کا محور ہیں۔ جو ان کو کم سنی میں دلہن بنا کر اپنے اپنے ارمان پورے کرنا چاہتے تھے۔ خوش قسمتی سے سلطان صاحب کے نصیب میں یہ جوہر کم یاب آیا چونکہ وہ بھی بلا کے جوہر شناس ہیں چنانچہ انہوں نے اس میں چھپی چمک دمک دریافت کر لی اور وقت کی نوکِ قلم سے تراش خراش کی تمام صبر آزما منزلوں سے گذار کر اسے گوہر نایاب بنا دیا۔

ایف اے سے لے کر ماسٹرز کی ڈگری تک کے تمام مراحل محترمہ نے نہ صرف انتہائی اعلیٰ کامیابی سے طے کئے بلکہ گھر شوہر اور بہت مہذب وفا ادب لڑکیوں کی تربیت وتہذیب بڑے بھرپور انداز میں انتہائی ذمہ داری سے نبھائی پھر اللہ پاک نے علم دیوانی کو علم ہی آبیاری کا سفر سونپ دیا۔ چنانچہ ماڈل ٹاؤن لائبریری کی جملہ ذمہ داریاں بھی بڑے تدبر و دیانت سے سنبھال لیں۔ محترمہ کو شاعری اور علم وادب سے وابستگی ورثہ میں ملی ہے ان کے والد القادری جناب مزمل حسین صاحب خود بہت قادرالکلام شاعر تھے۔ گھر کا ماحول جب علم وادب کا گہوارہ ہو تو پھر شہناز مزمل جیسی ہستیاں وجود میں آتی ہیں۔ محترمہ کی شاعری کے حوالے تو کوئی صاحب علم ہی لکھ سکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا ہو کہونگی ان کے ہاں الفاظ و معنی اور فکر و مشاہدہ ایک خوبصورت لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح پڑھنے والے کے احساس ذوق کو بڑی خوبی سے آسودگی بخشتے ہیں۔ ایسی باہمت مستقل مزاج خواتین بہت کم نظر سے گذری ہوں گی جنہوں نے نہ صرف انتھک محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی بیرونِ ملک بھی حصول تعلیم کے لئے گئیں۔ اور دنیا کے ادب میں

ایک نمایاں مقام حاصل کیا1985 سے 1997 تک 8 سال کا عرصہ بنتا ہے۔ جس میں ان کی بارہ تخلیقات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اور دو زیرِ طبع ہیں جس میں سات شعری مجموعے ہیں آٹھواں زیرِ طبع ہے۔ میرے ناقص علم کے مطابق شاید میں پاکستان میں کسی خاتون کے اتنے شعری مجموعے اتنی کم مدت میں شائع ہوئے ہونگے۔ عکس دیوار پہ تصویر۔ موم کے سائباں۔ میرے خواب ادھورے ہیں۔ ان کے تین بہترین شعری مجموعے ہیں حال ہی میں ان کا عارفانہ کلام پر مشتمل مجموعہ ''جادۂ عرفاں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد شعری مجموعہ ہے۔ 85-1989 سے اب تک کتابوں کے اعزاز ساتھ قدرت نے ان کو سال گولڈن جوبلی کے موقع پر 23 مارچ Puna نے سلمیٰ تصدق ایوارڈ پاکستانی تین نامور خواتین کو دیا اس میں سے ایک نام شہناز مزمّل کا بھی تھا۔

محترمہ کی رات دن کی انتھک محنت رنگ لائی اور جوبلی کے مبارک موقع پر انہیں حسن کارکردگی کے ضمن میں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ بے شک خلوص نیت سے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا حکومتِ پاکستان کا ایک بہت ہی ۔۔۔۔۔قدم ہے۔ کیونکہ ایسے اعزازات صاحب اقتدار لوگوں کے ایسے رویوں کی سند ہوتے ہیں۔ کہ وہ آج بھی اچھے کاموں کی پذیرائی پر متحد ہیں۔ انکا آنچل ایسے اسلاف کی روایات سے بہت مضبوطی سے بندھا ہے۔ یہ ایک باصبا اور باوقار تہذیب کی نمائندہ فنکار ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس دور میں کسی شاعرہ یا ادیبہ کیلئے بڑے فخر و اعزاز کی توجہ یقیناً ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بڑے صبر و تحمل اور ایثار کی بھی نشانی ہے۔ ''ادب سرائے'' اور ماڈل ٹاؤن لائبریری دونوں شہناز مزمّل کی ذات کا حصہ بن چکی ہیں۔ انہوں نے ''ادب سرائے'' میں آنے والے نوسوز لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر کے انہیں نیا حوصلہ دیا ہے۔ تو دوسری طرف کہنہ مشق شعراء اور ادباء کی علمی کاوشوں سے لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ایسی علمی کوششوں کو اگر ہمارے ہاں پذیرائی ملنے لگے تو بہت سے صاحب علم و فن لوگوں کی دریافت آسان ہو سکتی ہے۔ جن کے علم و مشاہدہ ہے سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں اور

مجھ جیسے دوسرے لوگ جو دور دراز علمی مراکز میں جانے کا وقت نہیں نکال پاتے محترمہ شہناز مزمل صاحبہ کی ان علمی وادبی کاوشوں اور پرخلوص عزائم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اس طرح علم وادب کی شمع روشن رکھیں۔ ان کی علم سے اس پروانہ وار وار۔۔۔۔ دیکھ کر بے اختیار ایک شعر لبوں پر آیا۔

رات سیاہی کو دیدیتا ہے پل بھر میں شکست
گو کفِ ہستی میں روشن میرے اک جگنو سہی

نجمہ یاسمین یوسف
254-ایل ماڈل ٹاؤن لاہور
01-10-1997

# مسز کتاب

محترمہ ہشت پہلو شخصیت کی مالک ہیں۔ گویا ان کے کئی روپ ہیں۔ یہ خود بھی ہشت پہلو ہیں کہ ہنستی مسکراتی رہنے والی یہ شخصیت اپنی جاذبیت اور حسن سلوک سے سب کے دل موہ لیتی ہیں۔ ہزاروں بکھیڑے پال رکھے ہیں۔ جانے کیسے انصاف کرتی ہیں یہ تو وہ جانیں یا خدا جانے مگر ہمیں تو لگتا ہے کہ رات بھر سونے کی بجائے لکھنے کا کام ہی کرتی رہتی ہوں گی یا پڑھتی ہوں گی۔ جتنی تعداد میں ان کی کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں اس سے تو لگتا ہے ہے کہ فرصت کا لمحہ خود ان کے لئے ترستا ہوگا۔ ان سے گھر والے وقت مانگ کر بات کرتے ہوں گے مگر ہمارا خیال ہے کہ ان کو دیکھنے سے لگتا ہے کہ مصروفیت نام کی کوئی شے ان کے قریب ہی نہیں پھٹکتی ہوگی ہر دم تر و تازہ اور فریش رہنے والی یہ ہستی کہاں مصروف رہ سکتی ہیں مصروف تو ہم جیسے لوگ ہوتے ہیں کہ جنہیں گھر کے کاموں سے اگر فرصت نہ ملے تو سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرتے ہیں۔ انہیں اپنے کام سے دلی لگاؤ ہے زیادہ حقیقی معنوں میں الفت ہے کہ یہ قائداعظم کے قول کام کام اور کام کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ تصویر کیا چلتی پھرتی تحریر ہیں۔ تحریر اس لئے کہ لکھ لکھ کر سراپا تحریر ہو چکی ہیں۔ کونسا موضوع ہے جسے انہوں نے نہیں چھیڑا کالم نگار افسانہ نگار شاعرہ بچوں کی کتابوں کی مصنف مذہبی رسائل لکھے۔ گائیڈ بک تک تو انہوں نے لکھ ماری ہیں کیا کہنے ہیں۔ ان کی اتنی تحریریں اتنے کم عرصے میں سامنے آئی ہیں کہ ان کے ذخیرہ الفاظ داد کے قابل ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی تمام ادبی سرگرمیاں اور اپنی نامکمل تعلیم شادی کے بعد شروع کیں اور مکمل کیں۔ پڑھی لکھی

ادیب اور شاعر خواتین شادی کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر گرہستی کی الجھنوں میں الجھ جاتی ہیں۔ بہت کم خواتین ہیں جو شادی کے بعد بھی سب کچھ جاری وساری رکھتی ہیں۔ ایسی خواتین میں یہ سرفہرست ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے کہ جانے انہوں نے کتنے دکھ پال رکھے ہیں۔ گویا ہر دم غم کی برسات ہی ہوتی رہتی گی۔ مگر ان کی شخصیت میں غم کا شبہ تک نظر نہیں آتا۔ انہیں دیکھ کر ہنستی مسکراتی تصویر ہی نظر میں رہتی ہے روتے ہیں چھم چھم نین کا تصور کم از کم ان پر فٹ نہیں آتا ہمارا تو ذاتی خیال ہے کہ یہ دوسروں کو روتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتیں ان کا بس چلے تو سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔

اپنے ایک شعر میں وہ خود کہتی ہیں۔

میرا شوق تھا مرا ہم سفر، تھی بلندیوں پر مری نظر
نہ زمین کی قید میں رہ سکی ہر اک آسماں سے گزر گئی

کتاب ان کا اوڑھنا بچھونا کتاب ان کی دوست بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ کتاب سے ہی انہوں نے شادی کی ہوئی ہے تو بے جا نہ ہوگا اس لحاظ سے اگر انہیں مسز کتاب کہا جائے تو یقیناً مناسب رہے گا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ چونکہ یہ لائبریری ڈائریکٹر ہیں اور لکھتی لکھاتی بھی ہیں۔ گویا ان کا کتاب سے پیدائشی رشتہ بھی ہے کہ والد صاحب بھی معروف شاعر تھے۔ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں رات کو کتاب پڑھے بغیر نیند نہیں آتی۔ کتاب سے اتنا گہرا رشتہ ہو تو یہی کچھ ہوتا ہے اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے کہ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک بھی لگ سکتی ہے۔ اب تو جدید ایجادات نے یہ مشکل بھی آسان کردی ہے کہ پہلے کانٹیکٹ لینس آئے اب لیزر شعاعوں کے ذریعہ کمزور نظر کا مکمل علاج بھی ممکن ہے گویا نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اب مسز کتاب کا کے لیے آسانی ہے کہ وہ جتنی مرضی کتاب پڑھیں انہیں کوئی خاص خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔

مسز کتاب کی محفل میں بیٹھ کر ان کی پر مغز باتیں سن کر بندہ صاحب ذوق ضرور بن جاتا ہے۔ اور صاحب ذوق بندہ اس قابل ضرور ہوتا ہے کہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے شرکت کر سکے۔ مسز کتاب کو پھول اور بچوں سے بہت محبت ہے کیونکہ بچے بھی پھول جیسے ہی ہوتے ہیں۔ بچوں اور پھولوں سے تو سبھی محبت کرتے ہیں مگر ان کی محبت بڑی منفرد اور دائمی ہے۔ یہ اپنی محبت نچھاور کر دینے کی حد تک ساری کی ساری سراپا محبت بن جاتی ہیں۔ بچوں سے محبت کا تو یہ عالم ہے کہ سب کو بچہ ہی سمجھتے ہوئے بڑوں کو بھی بیٹا یا بیٹی کہتی ہیں۔ کہ ان کے منہ پر بیٹا کا لفظ اب تو سجنے لگا۔

مسز کتاب کی گفتگو بھی بڑی متوازن اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اپنی تحریر کی مانند صاف ستھری اور آسان فہم الفاظ میں بات چیت کرتی ہیں۔ انہیں بے ہودہ گوئی اور بے ہودہ نگاری سے سخت نفرت ہے۔ اس لحاظ سے خود بھی صاف ستھری تحریر لکھتی ہیں اور بے ہودگی سے پاک گفتگو اور تحریر کو ہی پسند بھی کرتی ہیں۔ مسز کتاب حقیقی زندگی میں نانی کہلاتی ہیں مگر دیکھنے میں نانی اماں دکھائی نہیں دیتیں گویا اپنی عمر سے انتہائی کم دکھائی دیتی ہیں۔ اور نہ ہی دادیوں نانیوں کی مانند نصیحت کرتی ہے ہر ایک کی دوست بن جاتی ہیں اور خوب دوستی نبھاتی ہیں۔

مسز کتاب دکھ درد بانٹنے رہنے کو ہر دم تیار رہتی ہیں۔ حساس تو ہیں ہی کہ شاعر اور ادیب ہیں۔ مگر ان کے حساس طبیعت ہر پل مچلتی رہتی ہے۔ یہ حساس طبیعت ہر وقت بیدار رہتی ہے۔ کیا بات ہے ان کی حساس طبیعت کی کہ کسی کے دکھ پر آنسو بہانا بھی کسی کسی کا کام ہے۔ ان کی شاعری بھی دوسروں کے غم کی عکاسی کرتی ہے اور خود بھی یہ دوسروں کے غم کی تشہیر کرتی نظر آتی ہیں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے دکھوں پر زبان اور قلم دونوں طریقوں سے اظہار خیال کرتی ہیں اور دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ بنا لینے کا حق بھی صرف انہی کی ذات کا حصہ ہے۔

ان کے مزاج کی بھی اپنی ہی حقیقت ہے اس قدر نرم لہجہ کہ بچوں کو مات دیتی ہیں۔ اور سچا مزاج ان جیسا کم لوگوں کا ہی ہوگا سچا مزاج اس لئے کہ سچا اور کھرا مزاج بھی کسی کسی کے

حصے میں آتا ہے۔ اصولوں پر ڈٹی رہنے والی شخصیت بھی ان جیسی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آخر ایسی کونسی شخصیت ہے جس پر میں نے یہ مضمون لکھا ہے یہ منفرد ہمہ گیر شخصیت شہناز مزمل صاحبہ کی ہے جو معروف شاعر ادیب ہیں ماڈل ٹاؤن لائبریری کی ڈائریکٹر ہیں۔ آخر میں میں اس شعر پر اپنا مضمون ختم کرتی ہوں کہ۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کیلئے

مہر نسیم

اردو شعری مجموعہ

''میرے خواب ادھورے ہیں''

ڈاکٹر شہناز مزمّل

## تعارفی تقریب

05 دسمبر 1999ء ڈسٹرکٹ بار روم ہال جھنگ

کسی معاشرہ کی تہذیبی روح اس وقت قوت حاصل کرتی ہے جب ادب کی بنیاد فکر مسائل اور تاثیر طرز بیان پر استوار ہوں۔ اس کے برعکس آج کا دور ادب میں ایک پر اسرار یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے جس کی وجہ سے خالص تحقیقی عمل رک گیا ہے۔ میرے خیال میں اس جمود کو توڑنے کے لئے تنقید نگاروں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کیونکہ تخلیقی قوت اس وقت اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکتی ہے جب تنقید نے راہنمائی کرتے ہوئے راستہ متعین کر دیا ہو۔ دراصل تخلیقی ذہانت بنیادی طور پر نئے خیاالات کی دریافت اور ترتیب و تنظیم میں اپنے جوہر کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کی ذمہ داری تجزیہ و دریافت سے بڑھ کر تحلیل و اظہار میں ہے۔ اس پس منظر میں ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل ایک بے جہت تصادم کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا کلچر اور تہذیبی روایات واقدار کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے چاہیں کیونکہ اسی میں ہمارا ابقا پوشیدہ ہے۔ یوں تو ایک طرف جدید سائنسی ترقی فلسفہ کو پس پشت ڈال کر ہمارے طرز خیال پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے اور دوسری فطری کشش اس دائرہ سے باہر نکلنے کے لئے برسرپیکار ہے۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو مرزا غالب کے شعر میں اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اردو شعری مجموعہ

''میرے خواب ادھورے ہیں''

ڈاکٹر شہناز مزمل

تعارفی تقریب

05 دسمبر 1999ء ڈسٹرکٹ بار روم ہال جھنگ

کسی معاشرہ کی تہذیبی روح اس وقت قوت حاصل کرتی ہے جب ادب کی بنیاد فکر مسائل اور تاثیر طرز بیان پر استوار ہوں۔ اس کے برعکس آج کا دور ادب میں ایک پراسرار یکسانیت کا شکار ہو چکا ہے جس کی وجہ سے خالص تحقیقی عمل رک گیا ہے۔ میرے خیال میں اس جمود کو توڑنے کے لئے تنقید نگاروں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کیونکہ تخلیقی قوت اس وقت اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرسکتی ہے جب تنقید نے راہنمائی کرتے ہوئے راستہ متعین کر دیا ہو۔ دراصل تخلیقی ذہانت بنیادی طور پر نئے خیالات کی دریافت اور ترتیب و تنظیم میں اپنے جوہر کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کی ذمہ داری تجزیہ و دریافت سے بڑھ کر تحلیل و اظہار میں ہے۔ اس پس منظر میں ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل ایک بے جہت تصادم کی نشاندہی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا کلچر اور تہذیبی روایات واقدار کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے چاہیں کیونکہ اسی میں ہمارا ابقا پوشیدہ ہے۔ یوں تو ایک طرف جدید سائنسی ترقی فلسفہ کو پس پشت ڈال کر ہمارے طرز خیال پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے اور دوسری فطری کشش اس دائرہ سے باہر نکلنے کے لئے برسرپیکار ہے۔ یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو مرزا غالب کے شعر میں اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

صدر محترم! اس طرح دانشور طبقہ کے ذہنی طور پر مفاوج ہونے کے اثرات سماجی انتشار، رویوں میں تضاد، فکری عدم توازن اور سطحیت کی صورت میں عیاں ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے شعور کی وساطت سے ایک ایسا دائرہ فکری سطح پر قبول کر لیا جائے جس میں شرق و غرب کا وسیع ادراک شامل ہوتا کہ فکری بعد کم سے کم ہو سکے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر تہذیب کسی نظام خیال کو اپنے طرز احساس سے ہٹ کر مکمل طور پر قبول نہیں کرتی مگر اتنا تو ہو سکتا ہے کہ مطابقت رکھنے والے خیالات و نظریات میں ہم آہنگی سے قابل قبول صورت پیدا کر دی جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو ہمارے ہاں تخلیقی سرگرمیوں میں وہ جان باقی نہیں رہے گی جس کی بنیاد پر ادب کو عصری روح کا آئینہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ فریضہ تنقید نگاروں کو ہی آگے بڑھ کر ایک مشن کے تحت انجام دینا ہوگا۔ وقتی طور پر رفوگری سے کام چلانے کے بجائے نظام خیال اور طرز احساس میں تحریک پیدا کرنا ہوگی۔ اس تناظر میں ایران، روس اور چین کی روشن مثالیں عمدہ نمونے کی صورت میں موجود ہیں۔ اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ تہذیبی سطح پر پورے پاؤں کی بجائے پنجوں کے بل چلنے والے بہت جلد تھک جاتے ہیں اور اس تھکاوٹ کے اثرات ان کی تخلیقات سے عیاں ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں مسلسل عدم توازن کی جنگ جاری ہے۔ داخلی سطح پر اس اذیت ناک کشمکش میں مبتلا ہونے والے تخلیق کار بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں جس سے ادب کو شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ تخلیقی رویوں کے لئے ضروری ہے کہ زندہ نظام خیال کی قوت سے اس ٹوٹے ہوئے دھاگے کو پھر سے جوڑا جائے اس کی مثال سرسید احمد کی ہے جس نے اپنے دور کے عوامل کا تجزیہ کر کے فکر و عمل کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ یہاں سماجی شعور کی اہمیت ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ ادیب یا شاعر تہذیب و اقدار کی جس شاخ پر بیٹھا ہوتا ہے اسے کاٹ نہیں سکتا۔ اگر وہ کاٹنے کے بعد گرنے کے عمل سے بے خبر ہے تو وہ امکانات کا شاعر یا ادیب نہیں کہلا سکتا۔

حاضرین محترم! آج کی اس تعارفی تقریب میں خشک باتوں سے آغاز کر لیا ہے اب

اس گفتگو کو مزید طول دینا غیر مناسب تصور کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں یہ رجحان تقویت پا رہا ہے کہ جب بھی کسی شعری مجموعہ یا نثری تصنیف کی رونمائی یا تعارفی تقریب منعقد ہوتی ہے تو وہاں بالعموم تعریف و تحسین سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ ان مواقع پر جو کچھ سننا پسند کیا جاتا ہے اسے بقول ڈاکٹر جمیل جالبی تقریباتی تنقید کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شہناز مزمّل کے شعری مجموعہ ''میرے خواب ادھورے ہیں'' دراصل اس بات کا برملا اظہار ہے کہ وہ کچھ خواہشات ناتمام کو اپنے دامن میں سمیٹ کر منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ جس کا احساس غزلوں اور نظموں میں موجود ہے۔ غزل داخلی کیفیت کے بے باکانہ اظہار ہی کا نام ہے اس میں شاعر کو داخلیت کے سچے تاثرات کو پورے ارتکاز کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ غزل کا تخلیق عمل کوئی ایسا سیدھا سادھا کام نہیں جسے دیکھ کر شعر کا روپ دے دیا جائے۔ یہ شعر کا حد درجہ بیانیہ انداز کہلاتا ہے۔ جو اسے تاثیر سے گرا دیتا ہے۔ وہی شعر ارفع و اعلیٰ گردانا جاتا ہے جس کے اندر تجربہ کی شکست در بخت، جذبوں کی کشاکش، فکری دھاروں سے ٹکراؤ کے ساتھ ساتھ بے چینی، بے قراری اور اضطراب نے کھلبلی مچا رکھی ہو۔ باطنی الجھنوں اور کیفیتوں پر تصنع کی چادر ڈالنے سے فن بے راہرو ہو جاتا ہے۔ اشعار معنی و مفہوم اور خیال کے اعتبار سے نادر ہوں مگر جذبات سے تہی ہوں تو وہ متاثر نہ کرنے کی وجہ سے غیر معیاری قرار پاتے ہیں اگر جذبہ و خیال وحدت بن جائیں تو شعر ایک حسین پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ محترمہ شہناز مزمّل اپنے کلام میں فیض احمد فیض سے خاص متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ سماجی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں پر انہی کے لہجے میں بات کرتی ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو تھے منزلوں کے فراق میں سبھی راتے وہ مٹا دیئے
سرِشام ہی جو بھڑک اٹھے وہ چراغ میں نے بجھا دیئے

میں فریب وقت میں قید تھی رُخ کارواں نہ بدل سکی
کڑھی دھوپ میں جو ملے شجر تو وہی پہ ڈیرے جما دیئے

لئے ہاتھ میں وہ کٹے شجر اپنے رہے منتظر کہ ملے ثمر
نظر آئے اُن کو نہ بال و پر جو تھے گھونسلوں میں دبا دیئے
کبھی واہموں نے ڈسا مجھے کبھی چیختی رہی خواہشیں
میں جو مبتلائے فریب تھی سرِ دار سپنے سجا دیئے

نے فن کا معیار بتاتے ہوئے کہا کہ تخلیق کار اپنے تجربے میں آئے ہوئے تاثرات واحساسات کو اس طرح ظاہر کرے کہ دوسرے بھی اتنی ہی شدت سے اسے محسوس کریں اور ان پر بھی وہی کیفیت طاری ہو جو خود فنکار پر ہوتی تھی۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہا قاری پکار اٹھے کہ ''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔'' ڈاکٹر شہناز مزمّل نے اپنی شاعری میں جن مضامین کو باندھا ہے اردو غزل میں اس لحاظ سے اب کوئی خاص حد فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ کیونکہ دل کے لٹنے کے سانحات سے اردو غزل بھری پڑھی ہے مگر جسم کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود شہناز مزمّل کے ہاں عشق کا یہ تصور ایک فیشن بن کر سامنے نہیں آتا بلکہ صحت مند رجحان کا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن وہ انجانے خوف کے مہیب سایوں سے باہر نہیں نکل پائی۔ وہ حصارِ خوف میں مقید ہو رہ گئی ہیں۔ زندگی کے ـــــ سے خوفزدہ ہیں۔ بہادر عورت ابھی تک نہیں بن سکی۔ چند اشعار ملاحظہ ہیں۔

زندگی سے کیا ڈرنا آگہی سے ڈرتی ہوں
تیرگی کے موسم میں روشنی سے ڈرتی ہوں

سلگھتی ذات کا منظر نہیں دکھلا نہیں سکتی
ہوں مجرم آگہی کی کرب یہ سمجھا سکتی

چھپے ہیں میری مشت خاک میں کچھ آہنی جذبے
میں ان کو وقت کی بھٹی میں یوں پگھلا نہیں سکتی

مرزا غالب کو تو یہ شکایت رہی کہ اس کے خیاالات اتنے گہرے اور عمیق ہیں کہ انہیں مشکل الفاظ وتراکیب کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر شہناز مزمل ان بیساکھیوں کے سہارے نہیں چلتیں۔ وہ زندگی سے قریب تر ہونے، اثبات زیست پر ایمان رکھنے اور انسانی وجود کی اہمیت کو تسلیم کر کے لہجے میں شگفتگی اور الفاظ میں ۔۔۔۔۔ کے عناصر پیدا کر کے اظہارِ ذات کرتی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

سمیٹ لینا فضاؤں سے ساری رنگینی
کسے خبر کہ پھر مقدر میں پھر بہار نہ ہو

غزل کا ایک بنیادی عنصر ومز۔۔۔ ہے۔ اس کے عمدہ نمونے بھی کہیں کہیں دکھائی دیتے ہیں مگر ان تجربات میں تہہ دار گہرائی کے بجائے سطحیت زیادہ ہے مگر انہوں نے ان حدود کو بھی چھوا ہے جس سے تواتر احساس پیدا ہوتا ہے اور میرے خیال میں یہ انداز اب عوامی مقبولیت کا سبب بنتا جا رہا ہے۔ اس طرح انہوں نے رموز وعلائم موسیقیت اور، رواں محرومی کے توسط سے اپنی نظموں میں بھی رنگ تغزل پیدا کرنے کی کاوش کی ہے جن میں خاص کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں پتا ایک عورت کی۔ ابھی کچھ خواب بنا تھے۔ بے آب لہجہ معیاری نظمیں ہیں۔ نظم دشتِ فراموش کے اشعار ملاحظہ ہوں:

گردِ ایام میں لپٹے ہوئے جامد چہرے
سنج وحشت میں فروزاں کئی ساکت آنکھیں

رہ گیا جل کے زبوں حال تمناؤں میں
عہدِ رفتہ کے کسی طاق پہ یادوں کا دیا

سانس رکتی ہے مری دشتِ فراموش میں آج
کیسے جی پاؤں گی اس وقتِ گراں بار میں آج

ان کے اشعار چابی سے چلنے والے اس کھلونے کی طرح نہیں جو تھوڑی دور چل کر رک جائے۔ انہوں نے چونکا دینے والی باتیں بیان کر کے ادبی چابلاہٹ پیدا کر دی ہے۔ اس طرح ہلکی ہلکی اور دھیمی سی آگ میں سلگنے کا احساس جنم لیتا ہے۔ انہوں نے غم پر آنسو بہا کر جی کو ہلکا ضرور کیا ہے مگر مجلسی ماتم سے دور رہی ہیں اور اس بات کی قائل ہیں کہ عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں جیتی جاگتی اور ٹھوس حقیقتوں سے نبرد آزما ہوتی رہی ہیں۔

دہلیز اپنی ذات کی کب ہم نے پار کی
در کون سا تھا ایسا جو ہم پر کھلا نہ تھا

ہر نقش پا پہ ہو نہ سکی خم جبین شوق
جو نقش بھی ملا وہ تیرا نقش پا نہ تھا

یوں تو جہانِ رنگ میں سب کچھ تھا اس کے پاس
شہناز کی وفاؤں کا لیکن صلہ نہ تھا

غزل کے پاکستانی دور میں تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کو بھی منعکس کیا گیا ہے۔

اردو غزل کے اس ارتقائی سفر میں کلاسیکیت اور تغزل تو دھندلاہٹ کا شکار ہوا ہے مگر جدید دور میں نئے موضوعات کو بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ یہاں غزل کے مزاج کو ایک اہم موڑ مل چکا ہے جسے ہر شاعر برتنے کی سعی کر رہا ہے۔ ڈاکٹر شہناز مزمل بھی اسی تحریک میں شامل ہیں: چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں غمِ جاناں سے بڑھ کر غمِ دوراں موجود ہے سیاسی و سماجی حالات پر کچھ اس طرح نوحہ کناں ہیں۔

یہ شہر تو ہے میرا آنکھیں ہیں اجنبی سی
چہرے بدل گئے ہیں یا گھر بدل گئے ہیں
مسموم ہیں فضائیں معصومیت کہاں ہے
کھلتے گلاب چہرے یکسر بدل گئے ہیں
مظلوم تو وہی ہیں فرق اسقدر پڑا ہے
قاتل بدل گئے ہیں خنجر بدل گئے ہیں
ہم لاالٰہ کی خاطر اک سائباں تلے ہیں
دستار تو وہی ہے کچھ سر بدل گئے ہیں

بہر حال ڈاکٹر صاحبہ کے اس شعری مجموعہ میں قارئین کے لئے ہر ذائقہ موجود ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ وطن عزیز کی معروف شاعرات پروین ۔۔۔۔، کشور ناہید، شبنم شکیل، پروین شاکر، یاسمین حمید، نوشی گیلانی، افشاں عباس اور فرخ گیلانی نے اردو شاعری کو وقار بخشا ہے۔ اس نسائی شاعری میں محترمہ شہناز مزمل نے فکروفن کی جو شمع جلا رکھی ہے ان کی کرنیں تاریک راہوں کو دور دور تک روشن کرتی رہیں گی۔ میں اس شعری مجموعہ کی پیشکش پر انہیں مبارک پیش کرتا ہوں۔

# خسرو شیریں سخناں

(مطاہر ترمذی)

آج کچھ اور ہی جلوؤں میں فراوانی ہے
آسمانوں سے ملاتا ہے نظر فرشِ زمیں

علماء فضلا، حکماء اساتذہِ کرام، محترم المقام شعرائے عظام آج کی شام، تقریب سعید کا اہتمام، دریچہ ادب کا پیام ادبی سرگرمیوں کا رنگِ دوام، زیرِ چرخِ نیلی فام ایک مہتاب حسنِ تمام، مالک الملک کا ہے یہ انعام رحمتِ ذوالجلال والاکرام، اہل بزم کو میرا اسلام زبدۃ العظام کو سلام جناب برجیس حشمت، کوکب تابندہ، بخت فصاحت درخشندہ پائندہ تابندہ نکتہ داں، نکتہ بین، نکتہ رس، نکتہ سنج، فخرِ صد گلستان، نازِ صد گلشن کرسئ صدارت پر جلوہ فگن ہیں، رگِ مرغِ بسمل، شمعِ محفل، گلوں کا تبسم، نوائے منادل، خدائے سخن، رہنمائے منازل، ہادیِ شعراء، حارسِ ادب، قوتِ سخن، محافظِ اوزان، اک خطیب اک ادیب اک شاعر برش تیغِ تیز زورِ کلام۔ مہمان خصوصی اپنی نشست پر جلوہ فرما ہیں۔ رازدارِ جذبۂ غم، ردکش گلزار جوگئی بہاراں، مثالِ برگ گل، مثل بوئے گل، تاجِ زرتاب گہر ملک جوابر جلوۂ ماہ تاباں ناز شاہِ نازاں، شاہِ شمشاد قداں، خسروِ شیریں سخناں، مرجع فہم وفطنت وادراک، خوش خمیر و ذکاوت وافہام، مفتیٔ حسنِ علم وفضل وہنر جانِ حکم ذکات واحکام، عالم وفاضل وشاعری خبیر، رحمت وعفت وعظمت وانعام شہنشاہِ لسان محترم المقام محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل نشستِ خاص پر جلوہ افروز ہیں۔ ان کے استقبال کیلئے بزمِ دوستاں بھی ہے یہ بزم عالم بقعۂ نور، کرنوں کا نور ظہور یہ بزم پرتو مہر منور کی جھلک۔ تابشِ خورشید تاباں یہ بزم

انجم افاس، قطراتِ جسین نازنیں یہ بزم رشکِ صدفری وزہرہ وخورشید وقمر یہ بزم تیغ وشمشیر وسیف وخنجرِ ادب یہ بزم آتش کدۂ تابِ رخِ شعلہ جبیں یہ بزم آئینہ، رخسار و وقار و ۔۔۔ یہ بزم بہجتِ قلب ودل وروحِ رواں ۔۔۔ ہزار یہ بزم بحرِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو میں کیا میری بساط کیا

جوں خاکِ رہ گذار ہوں پامالِ پائے ناز
ضعفِ جنوں سے تارِ گریباں دریدہ ہوں
میں مرغِ اسیر حلقۂ دامِ کشیدہ ہوں
تصویرِ اضطراب ہوں تمثالِ درد ہوں
میں انتظارِ دیدۂ ناخواب دیدہ ہوں
میں نے تو خواب دیکھے نہیں سویا ہی نہیں
میں کیا عرض کروں کہ ادھورے خواب کیسے ہوتے ہیں
''میرے خواب ادھورے ہیں'' پر نگاہ ڈالی
کون کہتا ہے کہ میرے خواب ادھورے ہیں؟
یہ خواب! کیا پوچھتے ہو؟
خواب مرے ادھورے ہیں
قاری نے سوال کیا
کس کے خواب یہاں پورے ہیں
سب کے خواب ادھورے ہیں

''دشمنوں سے دوستی تجربہ، بدگمانی میں گماں کا ذائقہ، ۔۔۔ خواہش کا ہوا سے رابطہ، جبر موسم میں ان کا تجزیہ، فصلِ گل میں خوشبوؤں کی قید میں جکڑا ہوا، پتھروں کی بارش اور زخموں کا تجربہ

اک مسلسل، مسلسل تجربہ، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

یہ شاعری محترمہ شہناز کی آپ بیتی ہرگز نہیں یہ تو جگ بیتی ہے آج کی شاعری نہیں ہر دور کی شاعری ہے۔

ان کی شاعری

ملکہ ءِ حسنِ یقیں
شوکتِ عرش بریں
تخیل سے حسین
ہے یہ فردوسِ زمیں شاعری

خاص انداز رومان پرور اشعار قصے ہجر و وصل نغمے ماہ وصال جن میں سوزِ فراق، نشاطِ وصال حسن کی رنگینیاں، عشق کی بے تابیاں عالمِ بے خبر میں خواب جو دیکھے تو نظر آیا کہ ادھورے ہیں

خار انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اہل نظر سے پوچھا کیا دیکھا کہنے لگے
جو فسانہ زبان تک آ جائے
وہ سری داستان نکلتا ہے (ظفر ترمذی)
یہ خواب زندگی کے نشیب و فراز کے غماز

ہماری زندگی ـــ زندگانی نا سا سا۔ کی کہانی ہے۔ بقول سعد اللہ شاہ۔ ''محترمہ کے ہاں تخلیق کا ـــ پاکیزگی حب الوطنی اور محبت سے جڑا ہوا ہے۔'' ان کی شاعری میں فنی محاسن ـــ آخر میں بھی روانی بھی اور تابِ جادوانی بھی تہذیب انسانی بھی۔ واردات

---کا اظہار بھی جذبات کی مرجانی بھی ---کی شاعری حقیقی شاعری ہے۔

بہائے گوہر شبنم ہے آنسوؤں کی چمک
گلوں کے رنگ میں خونِ جگر ہے کیا کہیے

ان کی شاعری درد ویاس میں ڈوبی ہوئی ٹوٹے دلوں کی کہانی بھی ہے خواہشات کے انبار میں دبے ہوئے امید وبیہم کی کشمکش میں مبتلا انسان کے دل کی آواز بھی۔

نہ سمندروں سا مزاج تھا نہ فضاؤں جیسی تھیں وسعتیں
تو ہوا کے رخ پہ چراغ یوں شب تار سارے جلا دیئے

زمانے کے ستم زدہ لوگوں کی آواز کی غماز شاعری نے کہا۔

زخم یہ شہناز کیسے مندمل ہو پائیں گے
ہیں مسیحا تو بہت لیکن دوا کچھ بھی نہیں

-------میں آپ نے فن میں عبادت کاملہ -----،عروض کی خوامی بلندی - مضمون حسن ھی زورِ قلم، ندرتِ بیان سادگی و پرکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ یہ کلام عالمی اور آفاقی حیثیت کا حامل ہو گیا۔

ہے مرا خواب ادھورا اسے پورا کرلوں
نئی تعبیر کا عنوان بنالوں تو چلوں

یہ شاعری نہیں ساحری ہے۔

محترمہ کی زیرِ نظر کتاب ص اتا ص ۲ے محاسن سخن کی آئینہ دار کمال۔۔کی غماز ہے۔

ص 72 کے بعد کی شاعری کی بلا تبصرہ چھوڑ دینا ہی میرا تبصرہ ہے فقط اتنا ۔۔۔ گا کہ محترمہ نے سوچا ہوگا چلو ادھر کو جدھر کی ہوا ہو

وگرنہ آپ جبیں کینہ عشق شاعری کو اس بحر میں غوطہ زن ہونے کی چنداں ضرورت نہیں جس میں چھلانگ لگا کر گم گشتہء آشیاں کی طرح متقر ہی نہ رہے، الغرض آپ کی شاعری اردو ادب میں ۔۔۔۔ اہمیت کی حامل اور ایک خوبصورت اضافہ ہے، جو تاریخ ادب کے طالب علم کو ۔۔۔۔۔۔ اور فلسفیانہ مضامین میں پوشیدہ گوشوں کی تلاش کی دعوت دیتی ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

والسلام

## جاوید رُسوا

خوبصورت اور لطیف جذبوں کی شاعرہ ڈاکٹر شہناز مزمّل ہماری مہمان ہیں اور اس خوبصورت محفل کی جان ہیں۔ شاعرہ سے باقاعدہ میری جان پہچان تو نہیں مگر اہل قلم ہونے کے ناطے اظہارِ خیال کی جسارت کرر ہا ہوں۔ موصوفہ 11 کتابوں کی خالق ہیں۔ مگر میری قسمت میں انکی کسی کتاب سے استفادا حاصل نہیں کر۔ نا۔ ڈاکٹر صاحبہ ادھورے خواب کی شاعرہ ہیں۔ خواب دیکھتے رہنا چاہیے۔ خواب دیکھنا زندگی کی علامت ہے اور خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر ہو سکتے ہیں۔ دعا گو ہوں۔ اللہ شاعرہ کو مکمل خواب دیکھنے کی توفیق عطا کرے۔ خواب مکمل ہونے پر انکی آنکھ کھلے اور یہ اپنے خوابوں کی سچی تعبیر پالیں۔ اور جب انکی بارہویں کتاب آئے وہ میرے خواب پورے کے نام سے ہو۔ کہ نہ پڑھنے واا۱ کہے کہ میں نے خواب ادھورے دیکھے ہیں کہ خواب ادھورے پڑھے ہیں۔ اور خواب دیکھے جاتے ہیں سنائے جاتے ہیں پڑھے نہیں جاتے پڑھائے نہیں جاتے صرف اور صرف خواب دیکھے جاتے ہیں۔

کبھی    خواب    تو    پورے    دیکھے<br>
سرخ    گلاب    تو    پورے    دیکھے

دعا تیرے رسوا کی تجھ کو
سبھی خواب تو پورے دیکھے

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

دُعا گو

جاوید رُسوا

سیکرٹری فنانس قلم قبیلہ مکان نمبر 310
چمبیلی جھنگ صدر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم

صدرِ گرامیِ قدر، معزز سامعین محفل یہ امر باعثِ افتخار ہے کہ ہم آج ایک انتہائی پُر اثر لب لہجہ کی شاعرہ کے ساتھ شام منا رہے ہیں۔ سب سے پہلے میں محترمہ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ وہ اپنی دُہری مصروفیات کے باوجود ہماری جھنگ دھرتی کو اعزاز بخشا۔

معزز سامعین! اردو زبان کی ہمہ گیر وسعت عظمت میں کسی کو کلام نہیں۔ یہ زبان ہمارے اجتماعی تشخص کا نشانِ امتیاز ہے۔ پاکستان میں یہ زبان مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اس زبان مٰیں ہماری آج کی مہمان شاعرہ انتہائی اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ ان کی شاعری دھیمے دھیمے مدھم مدھم دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی یافتہ ادب کے نقوش ملتے ہیں۔ محترمہ شہناز مزمّل نے شاعری ایسی خوبصورتی اور سلاسل کے ساتھ بیان کی ہے کہ وہ معاملاتِ حُسنِ عشق کو دل کی چاشنی کے ساتھ خاص محبت و آہنگ سے پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے دل کے جذبات کا اظہار ہجر وصال کی کیفیت اور شکایتِ زمانہ کے ساتھ کیا ہے۔ جناب والا! دورِ حاضر کی شاعری صرف محبوب کے لب و رخسار تک ہی محدود نہیں رہی۔ آج کی شاعری میں غمِ دوراں، غمِ روزگار اور دورِ حاضر کے مسائل دکھ درد کی کٹھنائیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہوتا ہے۔

محترمہ شہناز مزمّل کی شاعری میں ایسا ایک اچھوتا حسن جمال ہے۔ جذبہِ محبت کو کامیاب کرتے ہوئے شاعرہ نے نشتریت کے پھول اپنے دامن میں ڈالے۔

محترمہ نے زبان وبیان کے نیکھے پن سے غزل کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ جناب عالی غزل میں کھل کر بات کرنا معیوب تصور کیا جاتا ہے اسی لیے محترمہ نے لب ولہجے کا خیال رکھتے ہوئے ایک نکھار پیدا کیا ہے۔ گھسے پٹے موضوعات کو زیرِ حراست نہیں کیا اور نہ ہی چبائے ہوئے تشبہات واستعارات کا استعمال کیا۔ آپ کے افکار ادبی بساط پر نہایت خوبصورتی سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غزل میں شوخ رنگ کی جولانیاں بھی محورقص نظر آتی ہیں۔ محترمہ شہناز مزمّل نے موسیقیت کی تیز دھنوں میں حسبِ حال الفاظ کے انتخاب کا کمالِ فن حاصل کیا ہے۔

ایک پختہ شاعرہ ہوتے ہوئے معاشرے کے ناہموار پہلوؤں پر بڑی مہارت سے نشتر زنی کی۔ ان کے ہاں ایک سلجھے ہوئے انسان کی گہری فکر عمیق مشاہدے کا برمحل وار محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری عملی زندگی کی تفسیر ہے۔ جناب والا! ان کی قلم سے جتنی بھی کتابوں کو وجود ملا وہ ان کی مسلسل محنت وجانفشانی کا مظہر ہے۔ آپ کا واجبی سا اظہار بھی سامعین کو جھومنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ آپ نے اپنے دل کی بات کو کچھ اس طرح صفحہ قرطاس پر اتارا کہ ہر دردمند دل رکھنے والے کی آواز بن کر سماعتوں سے ٹکرائی۔ آپ نے قومی زبان کے ذخیرہ ادب کے لیے بڑی خوبصورتی سے اضافہ کیا۔ محترمہ شہناز مزمّل نہ تو کسی کی حریف ہیں اور نہ ہی رقیب بلکہ آپ عزیز اور رفیق از رفیق ہیں۔ اپنے حلقہ احباب کے لیے ایک مدبر حوالہ سمجھی جاتی ہیں۔

گرامی قدر! صنفِ سخن ایک ایسی قوتِ جاذبہ ہے کہ ہزاروں میل کی دوری پر بھی کوئی ہم سخن مل جائے تو اجنبیت کے باوجود ادبی یگانگت کا احساس یک بیک جاگ اٹھتا ہے۔ پھر یہ کہ زبان جذبات کی بہترین ترجمان ہوتی ہے اور یہی جذبہ ہے جو فاضل شاعرہ کو آگے بڑھائے چلا جارہا ہے۔ بلاشبہ شاعری محترمہ شہناز مزمّل کی رگ وریشہ میں صالح خون کی طرح ۔۔۔۔ کیے ہوئے ہے۔ آپ دنیا کے ہنگاموں اور دلخراش صداؤں کے ۔۔۔۔ راز سے اپنی آواز کو بخوبی پہنچاتی ہیں

اور اپنی پوری توجہ سے اس پر کان دھرتی ہوئے قارئین کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک اترنا جانتی ہیں۔ شہناز مزمل ایک مثالی شاعرہ ہی نہیں بلکہ مثالی عورت بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توانیاں اور خوشیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے امین۔

نعیم انعم ھاشمی

200۔ دھجی روڈ جھنگ صدر

# لمحہ موجود کی شاعرہ

شہناز مزمّل کی شاعری کے بارے میں ہر اہم نقطہ پہلے ہی مقررین بیان کر چکے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں شہناز مزمّل صاحبہ سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود انہیں ان کی شاعری کے حوالے سے اچھا خاصا جانتا ہوں۔ بنیادی طور پر شہناز مزمّل کا تعلق شعراء کے اس قبیلے سے ہے جو اپنی سوچ اور وجدان میں تخلیقی کرب کو تلاش نہیں کرتے بلکہ یہ حسن ان اُن کے باطن میں پہلے سے ہی موجود ہے۔ وہ لمحہ موجود کی شاعرہ ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری محبت اور تکمیل ذات کے اردگرد گھومتی ہے۔ موضوعات کا۔۔۔۔ شہناز مزمّل کو شاعرات میں وہ مقام عطا کرایا ہے کہ اب ان کی پہچان ملک کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں نے شہناز مزمّل کی شاعری کو نہ صرف پڑھا بلکہ بغور پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اپنی شاعری میں ایک مضبوط لہجہ رکھتی ہیں جو برسوں بعد کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان کے چند اشعار کے ساتھ اجازت۔

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل صاحبہ

کیلئے

ایک تحریر

تسلیم تیرے فن کے پجاری تو بہت ہیں
عیسٰی ہے فقط ایک حواری تو بہت ہیں
کہنا ہے یہ شہناز مزمّل مجھے تم سے

# قیصر بھٹی

محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل کی کتاب میرے خواب ادھورے ہیں کی تقریب رونمائی کے موقعہ پر---

آجائے جدائی کا جو اک موڑ سفر میں
یاد آتی ہیں مجھکو کبھی غزلیں کبھی نظمیں
تھک جائے مسافر تو سکون دیتی ہیں قیصر
شہناز مزمّل تیری غزلیں تیری نظمیں

ملک کی نامور شاعرہ محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمّل کی نذر---ایک نظم

ہم نے دیکھا منظر منظر خواب ادھورے رہتے ہیں
سوچیں ہو جاتی ہیں پتھر خواب ادھورے رہتے ہیں
مان گئے ہیں اہل دانش پڑھکر تیرے شعروں کو
پیاسے رہ جاتے ہیں گو ہر خواب ادھورے رہتے ہیں
تو نے بھی شہناز مزمّل لکھا اپنی غزلوں---میں
سوکھے ہوں جب نین سمندر خواب ادھورے رہتے ہیں
اس نے بھی خوابوں کا ایک محل بنایا---جیون میں

ہر چند تیرے شعروں کے قاری تو بہت ہیں
ان کارگہہ شوق میں اس تاج محل میں
تجھ جیسا نہیں اور لکھاری تو بہت ہیں
یہ بات الگ بنتِ غزل ان کو نہ مانے
اس دشتِ تمنا میں شکاری تو بہت ہیں
اظہار یہ مصرعوں کا بناوٹ سے ہے تو نے
اس کرب میں راتیں بھی گزاری تو بہت ہیں
اشعار تیرے پڑھ کے مجھے لگتا ہے ایسے
پتھر جو اٹھائے ہیں وہ بھاری بہت ہیں
اب دیکھئے تقدیر عطا کرتی ہے کس کو
شہناز یہاں فن کے بھکاری تو بہت ہیں
منصب تیرا کیا ٹھہرا اقلیم سخن میں
کہتے ہیں وہاں ہفتہ ہزاری تو بہت ہیں
جو بن کے لہو ہے تیرے انفاس میں رقصاں
اس درد کے احساس عاری تو بہت ہیں
میں فن کا پرستار ہوں اسواسطے بیدل
غزلیں بھی مجھے یاد تمہاری تو بہت ہیں !

بیدل پانی پتی - جھنگ صدر-06/12/1999

# عشق در تلاش اولیٰ

پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق خان

جب میں ۲۰۰۰ء میں امریکہ کے دوسرے دورے کے بعد واپس آیا تو کچھ ہی دنوں بعد میری ملاقات محترم حفیظ صدیقی اور محترمہ زاہدہ صدیقی سے ہوئی۔ یہ ملاقات معروف شاعرہ یاسمین حمید کے دوسرے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی تھی جو آواری ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ حفیظ صاحب نے چونکہ میری شعری کتب اور سفرنامے کو علمی کتاب خانے پر برائے فروخت دیکھا تھا لہٰذا پتہ چلا کہ ان کا میرے ساتھ غائبانہ تعارف ہے۔ بعدازاں ہم لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ وجہ قربت ایک جیسا مزاج اور ذوق شعروادب تھا۔ پتہ چلا کہ حفیظ اور زاہدہ دونوں بہن بھائی مل کر ادب کی خدمت میں مصروف عمل ہیں اور وہ بھی بدرجہ اتم۔ دونوں کے کئی شعری مجموعے اور ادبی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ مزید براں وہ معروف مجلّے ''تحریریں'' اور ''شاخسار'' کے مدیران ہیں۔ تعارف کے بعد انہوں نے میرا ایک ضخیم انٹرویو شاخسار میں اور کچھ نگارشات تحریریں میں شائع کر کے مجھے اور بھی قریب کرلیا۔ ان کے ادبی ذوق کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگ میرے اور اپنے مزاج کو سامنے رکھ کر مجھے چند معیاری ادبی حلقوں کے نام بتائیں۔ جواباً انہوں نے چند نام بتائے جن میں سے صوتی تاثر کی بنا پر جو کام سب سے زیادہ دلکش لگا وہ ''ادب سرائے'' تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس حلقے کی ادبی سرگرمیوں کے پیچھے کون سی شخصیت کارفرما ہے تو بتایا گیا کہ شہناز مزمل۔ مزید بتایا گیا کہ وہ اس حلقے کی صدر بھی ہیں اور ہر ماہ ایک مشاعرہ اپنی رہائش گاہ ۱۲۵۔ ایف ماڈل ٹاؤن لاہور پر منعقد کرتی ہیں۔ میں نے بھی فرمائش کی کہ اگلے مشاعرے میں مجھے بھی لے چلیں۔ شہناز چونکہ ان دنوں بیرون ملک جارہی تھیں لہٰذا یہ مشاعرہ بوجہ مصروفیات بسیار حلقے کے سیکرٹری جناب شاہد بخاری کی رہائش گاہ واقع فیصل ٹاؤن پر منعقد ہوا۔ جس میں میں نے شہناز مزمل کو پہلی دفعہ دیکھا اور ان سے ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے میں لاہور کے معروف شعراء نے حصہ لیا۔ لہٰذا میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کرلیا کہ ادب

سرائے کے ماہانہ مشاعرے میں باقاعدہ شمولیت کیا کروں گا۔اس دن کے بعد اگر میں لاہور میں ہوتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ اس میں شمولیت ایک فرض سمجھ کر کی جائے۔شمولیت کی وجہ بلند ادبی معیار کے علاوہ صاف ستھرا ماحول اور بہتر وقت گزارنے کے لیے میسر سہولیات بھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے اور ایک دوسرے پر کیچڑ نہیں اچھالا جاتا۔علاوہ ازیں سگریٹ کے دھوئیں سے جان چھوٹی رہتی ہے۔اللہ کرے کہ شہناز کو ادب سرائے کے نکھار اور تزئین میں مزید کامیابیاں نصیب ہوں اور بطور سالار کارواں اس کی قیادت کرتی رہیں۔آمین۔

شہناز اب تک ''پیام نو'' سے لے کر زیر پرکھ ''عشق تماشا'' تک ۱۰۔شعری مجموعے شائع کر چکی ہیں اور تازہ مجموعہ بنام ''غم ادراک'' زیرِطبع ہے۔ان کی شائع کردہ شعری کتب کی فہرست میں ایک کتاب بعنوان "Ten Poets of today" بھی ہے۔جو میری نظر سے نہیں گزری۔نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت انہوں نے بطور مرتب کی ہے۔علاوہ ازیں وہ ایک معروف مصنفہ بھی ہیں اور ان کی پانچ نثری کتب شائع ہو چکی ہیں۔اردو اور انگریزی میں ان کی تحریریں اور نگارشات اس امر کی غماز ہیں کہ ان کے ادبی ذوق اور نگارشات کا معیار بہت بلند اور قابل تحسین ہے۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

مجھے ان کی دو شعری کتب بعنوان ''موم کے سائبان'' اور ''عشق تماشا'' اور برمنگھم میں مقیم معروف شاعرہ رضیہ اسماعیل کا شائع کردہ شعری انتخاب قرض وفا جو کہ ان کی تمام شاعری کا نچوڑ ہے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ان کتب میں سے موخرالذکر میں نے ایک طائرانہ نظر کے بعد اپنی اہلیہ محترمہ کے حوالے کی اور کہا کہ اسے آپ پڑھیں اور جو اشعار اچھے لگیں ان کی نشاندہی کریں۔ انہوں نے اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا اور ایک آدھ دن میں ختم کرنے کے بعد اتنی تعریف کی ہمیں احساس کم مائیگی میں مبتلا کر دیا۔اگلے مشاعرے میں میں نے شہناز مزمل کو ان کی شاعری کے بارے میں رضیہ کے تاثرات کو اس انداز میں گوش گزار کیے ''خوب بہت خوب، شہناز! آپ نے تو ہمارے نمبر ہی کٹوا دیے۔'' ساتھ وجہ یہ بیان کی بیگم صاحبہ کو رومانی شاعری بہت پسند ہے اور میں آج کل زیادہ تر حالات حاضرہ کو سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں اور نگارشات میں اپنے تجربات وحوادث کو بھی جگہ دے رہا ہوں۔

''شہناز مزمل'' کا معصومانہ تبصرہ یہ تھا کہ وہ رومانیت کی شاعرہ نہیں وہ تو تصوف کی شاعرہ ہیں۔ہم نے اس وقت اس مکالمے کوصرف یہ کہہ کرختم کردیا کہ ''تصوف بھی تو رومانویت کی انتہا ہے۔'' ساتھ ہی شہناز نے ہمیں یہ بھی یاددہانی کروادی کہ ''عشق تماشا'' کے بارے میں آپ کی رائے درکارتھی کب ممکن ہوگا۔'' گھرلوٹے تو تواس احساس کے ساتھ کہ شہناز مزمل کس قدر معصوم شاعرہ ہیں جومدتوں سے تلاش ذات کے ساتھ تلاش اولی میں ہیں لیکن ان کی لاتعدادخوبیاں جن کا اظہاروہ اپنی شاعری میں کربھی چکی ہیں ان کی ذات سے مخفی ہیں۔ان خوبیوں سے پردہ اٹھانا ہی ''عشق تماشا'' پررائے دہی کاسب سے بڑا مطمع نظر ہوگا۔

تو لیجئے ہم اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ بیان صادر کرتے ہیں کہ شہناز مزمل'' سہ منازل شاعرہ ہیں جن کے دائرہ نگاہ کا پھیلاؤ مجاز سے حقیقت تک محیط ہے۔سہ منازل شاعرہ اس لیے کہا ہے کہ عشق تماشا تین موضوعات پر مشتمل ہے۔غم جاناں،غم دوراں،غم ہجراں۔

وہ اس سہ منازل عشق کی بھی برحق دعویدار ہیں جو مذکورہ سہ منازل شاعری کا محرک مطلق ہے۔ہمارے نزدیک سہ منازل شاعری بہت بڑی بات ہےاوراس کامحرک عشق بھی۔یہ عشق پہلے مرحلے ایک دوجے کے ساتھ آنکھیں دوچار ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ ہر دو چاہتوں کے درمیان گفتگو بھی آنکھوں کی زبان میں ہوتی ہے۔چونکہ دلوں میں جذبات کاایک سمندر ٹھاٹھیں ماررہاہوتا ہےلہذا چاہتیں نہ جانے کیا کیا کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کہہ نہیں پاتیں کیونکہ سماجی پابندیاں اورایک دوجے کاڈر کہنے سننے کے عمل میں مانع واقع ہوتے ہیں۔بسا اوقات خموشی ہی گفتگو ہوتی ہےلیکن آخرکب تک؟ایک وقت آجاتا ہے کہ اظہار محبت ہوجاتا ہے۔عہد و پیان ہوتے ہیں، پیار کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ساتھ ساتھ عشق مجازی کا ارتقا ہوتا ہے۔اگرآسانی سے ملاپ ہو جائےتو سمجھیے کہ محبتوں کی شام پر پھیلائے وارد ہونے والی ہے۔لہٰذا عشق مجازی خام رہتا ہے۔ اس کی تکمیل تب ممکن ہوتی ہے کہ چاہیں مل کر بچھڑ جائیں یہی وہ موڑ ہے جہاں سے فرقت کے لمحات شروع ہوتے ہیں کیونکہ اس موڑ پر وصل جاناں کی جگہ غم ہجراں لے لیتا ہے۔چاہنے والوں پر یہ لمحات کٹھن ترین ہوتے ہیں کیونکہ بقول اقبال:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

یہی وہ مرحلہ ہے کہ جہاں عشق مجازی کی غماز شاعری بھی اپنے ارتقا کی منازل بڑی تیزی سے طے کرتی ہے اور اسے شعری جمالیات کی انتہا تک پہنچاتی ہے۔

اگلا مرحلہ غم جاناں سے غم دوراں کی حدود میں داخلے کا ہے اس داخلے کی جو قوت ممکن بناتی ہے وہ غم ہجراں ہے۔ یہی وہ غم ہجراں ہے جو انسان کو ''دیدۂ بینا'' عطا کرتا ہے۔ غم ہجراں کا شکار مخلوقات میں سے جسے بھی دیکھتا ہے تو اسے اس طرح دیکھتا ہے کہ ''اگر اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے تو تیرے ساتھ بھی تو ایسے ہی ہوا تھا'' یا ''اگر میرا اس میں قصور نہیں تھا تو تو اس بیچارے کا بھی تو کوئی قصور نہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ لٰہذا غم ہجراں کا مارا ہوا عاشق ہر دوسرے کی ذات کو اپنی ذات کے مترادف گردانا شروع کر دیتا ہے اور یہی غم دوراں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو کسی شخص کو اپنے قریبی عزیز و اقارب سے لے کر ملک و قوم، ملت یہاں تک کہ ہم انسانیت کا عظیم ترین ہمدرد یہاں تک کہ وکیل بنا کر میدان عمل میں اتارتی ہے۔ شاعری بھی اسی طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور بقول فیض احمد فیض شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اسی طرح علامہ اقبال جیسا فلسفی شاعر کہتا ہے کہ:

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم

جب انسان غم دوراں کے تحت انسانیت نوازی کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے تو وہ بالفاظ دیگر حقوق العباد ادا کر رہا ہوتا ہے اور حقوق العبار کو خالق مطلق نے حقوق اللہ سے بھی بلند درجہ دیا ہے بلکہ حقوق العباد کی ادائیگی ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے عالم بالا کے دروازے وا ہوتے ہیں تا کہ وہ بلند پروازی سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں عشق دیگراں عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس مرحلہ پر عاشق کا دل چاہتا ہے کہ وہ ''اپنی ذات'' کو ''اس کی ذات'' میں ضم کر دے۔ عشق حقیقی وہ قوت ہے جو عاشق کو ''دیدۂ دل'' عطا کرتی ہے۔ جب عاشق کو ''دیدۂ دل'' عطا ہو جاتی ہے تو کائنات کی تمام قوتیں اس کے اندر سمٹ آتی ہیں اور وہ نگہہ عطا کرتی ہے جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ:

جو دیدۂ دل سے اٹھتی ہے
وہ نگہ ہے مرد مومن کی

ہے عشق جو اس کی ایزجی
جب عرش کا یہ رخ کرتی ہے
تو وقت کا لامحدود سفر
اک جست میں تہہ ہو جاتا ہے

آیئے! اب ''عشق تماشا'' کے ان اشعار کی طرف رجوع کریں جو شہناز مزمل کی سہ منازل شاعری کا بین ثبوت ہیں۔ وہ رومانویت کی انتہا میں فرماتی ہیں:

عشق پابند سلاسل ہے نہ پابند مکاں
بے وجہ دیوار میں عاشق کو چنوایا گیا
ٹوٹنے والے تعلق کا اعادہ کر لیں
آؤ کچھ دیر محبت پہ بھروسہ کر لیں
کیا پھر جاگی کوئی خوابیدہ حسرت
ترے ہونٹوں پہ پھر حرف دعا ہے
چشم پرنم کے جھروکوں میں چھپا لوں نہ تجھے
اپنے سے دور تجھے کیسے میں بیٹھا دیکھوں
تو نے جاتے ہوئے اک بار تو سوچا ہو گا
ہمسفر! تیری رفاقت تھی ضرورت میری
کس جگہ جا کے چھپا ہے یہ بتا دے مجھ کو
ڈھونڈ کر کیوں نہیں لاتی تجھے چاہت میری
خوشبو کی طرح ساتھ ہے شہناز کے ہر دم
تنہائی کے جنگل میں بھٹکنے نہیں دیتا

یہ تھے چند منتخب اشعار جو ہم نے شہناز کی رومانوی شاعری کے نمائندہ طور پر پیش کر دیے۔ ان میں محبوب سے پیار بھری گفتگو بھی شامل ہے اور مل کر بچھڑنے کا دکھ بھی لیکن دریں اثنا بچھڑ کر ملنے کی امید شامل حال ہے۔ رومانویت کا گراف اس وقت گرتا ہے جب یہ امید ختم ہو جاتی ہے اور غم ہجراں کے بادل اُمڈ کر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ شہناز کی شاعری کی رومانویت کا ''ڈراپ

سین'' ہے۔اس ڈراپ سین کے نمائندہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جو سر تاپا محبت تھے جدا وہ ہوگئے جب سے
سکوں دل کو نہیں ملتا ، پریشانی نہیں جاتی

دل کی بستی میں ترے دم سے چراغاں رہتا
چشم پر نور کو بے نور نہ لکھا جاتا

تخت سلطان اجڑتا نہ بچھڑتے ہیں ہم لوگ
شاہ کی ناز کو مزدور نہ لکھا جاتا

رومانویت کے اس ڈراپ سین کے بعد شہناز کدھر کا رخ کرتی ہیں۔آ یئے دیکھتے ہیں۔

ہمیں اس امر پر کوئی شک نہیں کہ شہناز مزمل جیسی حساس ادیبہ اور شاعرہ بچپن سے ہی انسان نواز اور انسان دوست ذات کو دیکھنا شروع کر دیتی ہیں اور وہ بھی بڑی شدت سے۔بقول کے

''میں نے اوروں کے غم کو بھی اپنا لیا
دیکھتا ہی رہا
دور حاضر کی پر پیچ سکرین پر
دکھ کے گہرے نشاں''

بقول شہناز:

جب زاویے نگاہ کے یکسر بدل گئے
پھیلی تپش تو نقش تمنا بکھر گئے

وہ آسماں مزاج جراحت سرشت تھا
ہم دل کے آئینے کو بچا کر نکل گئے

جونہی ''نقش تمنا'' بکھرے تو شہناز نے کائنات میں موجود ہر شے کو اپنی ذات کے ساتھ منسلک کرلیا اور بڑے خلوص دنیا اور مافیہا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بہ چشم بینا مشاہدہ کیا۔مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مشاہدے کا آغاز اپنے گھر سے کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

روشنی ہونے کی ملتی ہی نہیں کوئی خبر
اپنے ہونے کی زمانے کو خبر کیسے دوں

جب تیری اولاد ہی تجھ سے نہیں ہے مطمئن
تیری ساری جستجو تیرا ہنر بیکار ہے

گھر سے باہر نکلتی ہیں تو کہتی ہیں:

اس عہد کے یزید کا کس سے کریں گلہ
خیمے تمام اپنے ہی ہاتھوں سے جل گئے
جب ملی چھاؤں ہمیشہ دھوپ کے نیچے ملی
عمر بھر ہم انتظار سائباں کرتے رہے

غم دگراں کا ان پر اثر اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ حقوق العباد کی علمبردار بن کر بڑی بیبا کی سے میدان میں اترتی ہیں اور کہتی ہیں:

آرزو کی جھیل کو دریا کبھی کرنا نہیں
شہر ناپرساں میں جانے سے کبھی ڈرنا نہیں

شہناز کی بیبا کی ان کی نظم ''کل آج کل'' مزید تقویت پانے کے بعد انتہا تک پہنچ جاتی ہے اور وہ برملا اعلان کرتی ہیں۔

غلط سمجھا تھا مجھ کو میرے ہونے کی سزا دو گے
مرا ناطہ قلم کاغذ سے انمٹ ہے پرانا ہے
اسی کاغذ کی ناؤ پر ہی دریا پار جانا ہے
مجھے جرأت، حرارت، زندگی لفظوں سے ملتی ہے
میں چنری اوڑھ کر الفاظ کی دھوپوں میں چلتی ہوں
میں ہر لمحہ نئے احساس کی بھٹی میں جلتی ہوں
میں سورج ہوں مگر جذبوں کی حدت سے پگھلتی ہوں
میری تحریر میری ذات کا پرتو ہے ایماں ہے
مری تحریر میرا بادباں بھی سائباں بھی ہے

وہ ایک خاتون کی حیثیت سے حقوق نسواں کی وکالت میں ثانی نہیں رکھتیں جب وہ کہتی ہیں کہ:

غلط سمجھا تھا میری سوچ پر پہرے بٹھا دو گے
غلط سمجھا تھا میری فکر کو بنجر بنا دو گے
غلط سمجھا تھا کٹ پتلی بنا کر تم نچا دو گے
غلط سمجھا تھا ناممن کو ممکن سے ملا دو گے

عورت کی حالت زار کا جس قدر حقیقت پسندانہ تجزیہ شہناز نے اپنی نظم ''زندہ لاش'' پیش کیا ہے آج تک کسی نے نہیں کیا۔

حق کی متلاشی عورت کو عریاں ذہن کے مالک چہرے
آزادی کی چھاپ لگا کر مصنوعی اک خول چڑھا کر
جھوٹی رسمی آس دلا کر عورت کو عورت منوا کر
ہمدردی کا جال بچھا کر شمع محفل اس کو بنا کر
دام میں یوں الجھا لیتے ہیں اپنی شام سجا لیتے ہیں
عورت کو عورت ہونے کی اتنی سخت سزا دیتے ہیں

ہماری نظر میں شہناز کی غم دوراں کی شاعری کے دو بڑے مثبت پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ عورت کی وکالت کرتے ہوئے دوسرے ادیباؤں اور شاعرات کی طرح بغض معاویہ سے کام نہیں لیتیں۔ وہ مردوں سے بھی اتنا ہی پیار کرتی ہیں جتنا کہ عورتوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مردوں میں عورتوں کی نسبت زیادہ مقبول شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔

دوسرا پہلو یہ کہ ان کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر نہیں پایا جاتا وہ ہر وقت پر امید رہتی ہیں کہ نہ صرف ظلم و ستم کی ماری ہوئی اور ہر دم سسکتی ہوئی عورت کے حالات ضرور بدلیں گے بلکہ اللہ تعالی ہمہ مخلوقات پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا جو سب کے حالات کو بدل دیں گے۔ ملاحظہ فرمائے اس پہلو سے متعلق چند اشعار:

وہ انتہائے زعم میں پیچھے مڑا نہیں
ہم انتہائے شوق میں آگے نکل گئے
وقت کے بدلنے سے قسمتیں بدلتی ہیں
آؤ ہم دعا مانگیں آیتوں کے موسم میں

راستہ ڈھونڈ لے شاید کوئی بھولا بھٹکا
ان چراغوں کو سر راہ جلا رہنے دو
مجھ کو اجداد کی اقدار بہت پیاری ہیں
میری دہلیز پہ مٹی کا دیا رہے دو
تشنگی دید کی کم ہو نہیں پائی اب تک
خشک ہونٹوں پہ کوئی حرف دعا رہنے دو

ہم اس سے بیشتر عرض کر چکے ہیں کہ قادر مطلق کے نزدیک حقوق العباد حقوق اللہ سے زیادہ مستحسن ہیں۔ بالفاظ دیگر حقوق العباد کی بجا آوری فرش سے عرش تک رسائی کا زینہ ہے۔ بقول کسے:

یہ تھی ادا جو شان کریمی کو بھا گئی
اس کی تجلیات میں جس کا اثر گیا
میں بیکراں محیط میں مثل گہر گیا
یہ ذات اس کی ذات میں تحلیل ہو گئی
اس طرح میری ذات کی تکمیل ہو گئی

اب وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جس پر شہناز مزمل کے عشق کی تمام اشکار روپ سے بہروپ دکھائی دینے لگتی ہیں اور تمام ایک دوسرے میں ضم ہونے کے بعد عشق حقیقی میں ضم ہو جاتی ہیں کیونکہ:

درحقیقت مالک ہر شے خداست
ایں امانت چند روزہ نزد ما است

لہٰذا آج کل شہناز کا صرف ایک ہی روپ ہے اور وہ ہے ایک صوفیہ کا روپ اور ان کی شاعری کیا ہے فقط ان کے تصوف کا عکس زریں۔ اب ان کو صرف ایک ہستی کی تلاش ہے تاکہ اس کی ذات میں ضم ہو کر وہ تکمیل ذات کر سکیں۔ اس غزل پر انہوں نے کونسی ذیلی منازل طے کی ہیں؟ اس سوال کا جواب درج ذیل ہے۔

پہلے ذیلی مرحلے پر اپنے من میں ڈوب کر اپنے آپ کو تلاش کرتی ہیں:

اپنی تلاش کرتے زمانہ گزر گیا
میں کون ہوں میں کس لیے دنیا میں آ گئی
عرفانِ ذات نے مجھے حیراں کر دیا
دوڑا رہا ہے مجھ کو میرا ذوقِ آ گہی

............

عجب محشر سا ایک مجھ میں بپا ہے
میرے اندر بھی شاید کربلا ہے
بظاہر ہوں میں ایک ناچیز قطرہ
میرے اندر سمندر بولتا ہے

عرفان ذات اب ان کا ہادی بن جاتا ہے اور وہ تلاش حق میں در بدر پھرتی ہیں اور کہتی ہیں:

آ کر زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے تھے ہم خدا
جھانکا تو اپنی ذات کے اندر چھپا ملا
بس ایک نقش پا پہ ہوئی خم جبین شوق
پھر اس کے بعد نقش تمنا مٹا دیا
عاشق یقیں کا ہاتھ میں تھامے گا جب دیا
مل جائے گا جواب اسے ہر سوال کا

اب دماغ کی بجائے دل کی آنکھ سے دیکھنے لگتی ہے اور بالآخر یہ دعوی کرتی ہیں کہ:

اہل دانش نہ کوئی عالم و دانا سمجھا
بات سمجھا تو میری صرف دوانہ سمجھا

دوسرے ذیلی مرحلے پر ان کا عشق حقیقی پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ انتہا پر پہنچتا ہے تو وہ اپنے محبوب حقیقی کو بھی ''جاناں'' کہہ کر پکارنے لگتی ہیں۔ یاد رہے کہ وہ وہی لفظ ہے جو شروع میں انہوں نے اپنے مجازی محبوب کے لیے مختص کیا تھا بلکہ ویسے ہی ان کا ''غم ہجراں'' گو وہ محبوب مجازی کے ہجر میں تھا اب محبوب عالی کے لیے مختص ہو گیا ہے۔ اس روش کے پیچھے فلسفہ بلکہ وہی ہے کہ ''میرا سب کچھ تو ہی تو ہے دوسرا کوئی نہیں۔'' یہی قول اقبال رمز بے خودی کی ہے۔ اس کا اظہار شہناز نے

اپنی نظم ''انا کی چیخ'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

انا کی چیخ دب کر رہ گئی ہے
کھرچ دوں لوحِ دل سے نقش سارے
حصارِ راہ تیری چاہتیں ہیں

ساتھ ہی وہ اپنی نظم ''حصارِ آئینہ'' میں اپنی ذات کو یہ بشارت دیتی ہیں کہ:

حصار آئینہ خانہ
لگا ہے ٹوٹنے جاناں
سبھی منظر بدلتے ہیں
میرا منظر بھی بدلے گا

لیجئے شہناز نے اپنی ذات کو پہچان لیا اور اگلی ذیل مرحلے پر آ گئیں کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ‘ فَقَبْ عَرَفَ رَبُّکَ اور انتہائے عشق میں اپنی غزلوں میں تلاش اولی کا اظہار کرتی ہیں آخری پر اعلان کرتی ہیں کہ انہوں نے اس ذات کو پا کر کائنات کی ہر چیز کو سمیٹ لیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

فیصل درد کے گنبد میں شب بھر
تیری آواز اب تک گونجتی ہے
دکھا شہناز کو اب خواب رستہ
یہ لمبی رات اب ڈھلنے لگی ہے

............

نماز عشق قائم ہو گئی ہے
ترا عاشق مکمل ہو گیا ہے
میں جو مانگوں گی وہ مجھ کو ملے گا
بتا کاتب تیرا کیا فیصلہ ہے

............

میرے اندر تو اس کی روشنی ہے
تعلق جس سے میرا دائمی ہے
میں اپنے آپ کو کیسے سمیٹوں
اکائی ذات کی بکھری پڑی ہے

آخری مرحلہ میں شہناز میں جرأت زندانہ آ گئی ہے جس کے تحت وہ اپنے محبوب اول یعنی خالق کل سے براہ راست گفتگو کرتے ہیں۔ایک غزل میں ان کا انداز گفتگو ملاحظہ فرمائیے:

کسی کی چنری میں دھوپ باندی کسی کو وجہ جمال رکھا
کسی کے دامن میں صبح ٹانکی کسی کو شب کی مثال رکھا
رضا پہ تیری ہوئی میں راضی مگر مجھے آج یہ بتا دے
جواب سارے دیے کسی کو میرے لیے کیوں سوال رکھا
جہاں کے تخلیق کار تو نے یہ کیا کیا ہے یہ کیوں کیا ہے؟
بنا کے انساں کو سب سے افضل اس کو رو بہ زوال رکھا
تمام عمر نہ جس کا جواب مجھ کو ملا
تمام عمر وہی ایک سوال میں نے کیا

یہ وہ مرحلہ ہے جس پر پہنچ کر بقول مولانا روم:

گرچہ آں از حرف عبداللہ بود
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

لہٰذا اب ہم شہناز مزمل کو ایک مکمل انسان ہونے کی بشارت دیتے ہیں اور ساتھ ہی مبارک باد بھی اور یہ کہہ کر اجازت چاہتے ہیں کہ:

غم جاناں ، غم دوراں ، غم ہجراں داری
رخ تاباں ، حسن پنہاں ، دل خوباں داری

# مایہ ناز شاعرہ وادیبہ

## محترمہ شہناز مزمل صاحبہ

کی ''ادب سرائے'' ماڈل ٹاؤن کی ''ادبی محافل'' میں حاضر اور سننے سنانے کا متمنی

خادم شعروادب

ناچیز:۔ سعید احمد بودلہ
گرافک ڈیزائنر۔ مصورانہ کیلی گرافر
پینٹر (آئیل کلرز) ادنی ادیب وشاعر (اردو پنجابی)
538/F-II جوہر ٹاؤن لاہور فون 5300242

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاعرہ وادیبہ محترمہ شہناز مزمل صاحبہ!

السلام علیکم،

آپ الحمدللہ بخریت ہوں گی اور ''ادب سرائے'' کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی تخلیقات قلمبند کرنے میں مگن بھی!

عظیم انٹرنیشنل پرائڈ آف پرفارمینس مصور، مصورانہ خطاط، شاعر، ادیب وسفرنامہ نگار محترم جناب اسلم کمال صاحب کا گرویدہ اور معتقد ہونے کے ناطے ان کے نیاز حاصل کرنے کے لیے میں گاہے گاہے ''ایوان اقبال'' جاتا رہتا ہوں۔

بتاریخ ۵ جون۲۰۰۳ء ان کی مصروفیات مقابلہ مصوری کی پرکھ میں دیگر ججز کے ہمراہ تھی۔ اس دوران میں ان کے آفس میں دو تین گھنٹے رہا اور ان کی اجازت سے ان کی لائبریری سے استفادہ کرتا رہا۔

اتنی کتب پڑھی تو نہ جاسکتی تھیں اس لیے صرف ورق گردانی پر اکتفا کرنے کا ارادہ کیا۔

اسی دوران آپ کا دستخط شدہ دیوان ''عشق تماشا'' ہاتھ آیا۔ ذرا غور کیا تو تیز تر ورق گردانی یکدم رک گئی۔ کلام کی شائستگی اور وسعت کے زیراثر بڑی توجہ اور گہری سوچ سے آپ کا کلام پڑھا اور بہت مستفیض ہوا۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک شعر کی جامعیت سے سرشار جوں جوں پڑھا توں توں شوق وولولہ بڑھتا چلا گیا۔ کاغذ وقلم تھام کر آپ کے چیدہ چیدہ اشعار درج کرتا رہا۔ میں آپ کی شعرانہ تخلیقات کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک ادنیٰ مصور و ڈیزائنر ہونے کے ناطے میں آپ کی شعرانہ مصوری کے خدوخال میں ایسا کھویا کہ دو تین گھنٹے ''عشق تماشا'' کے تخلیقی وعلمی حسن کی جلوہ گری میں مگن رہا۔

آپ کی شاعری ایک عظیم شعرانہ مصوری ہے جو ایک پورٹریٹ ہے تو ایک وسیع کمپوزیشن بھی۔ اگر ایک اسٹل لائف ہے تو ایک خوشبودار ہرا بھرا گلدستہ بھی۔

آپ کی شاعری میں کائناتی حسین مناظر بھی ہیں تو زمانے کے سنگین حالات بھی۔ آپ کے شعر خود بولتے ہوئے تصویری جامہ پہنے نمودار ہوتے ہیں۔ جن میں ہر سو رنگ ہی رنگ بکھرے

ہوئے ہیں۔ جو غمگین دلوں کو تسکین و فرحت اور روح کو جاودانی بخشتے ہیں۔ آپ کی غزلوں، نظموں اور قطعات میں حساسیت، پاکیزہ تصوف و معرفت، علم و حکمت، احتیاط و سنجیدگی، رندانہ شوخی اور اور اک اچھوتی تخلیقی ادا اس انداز سے جلوہ گر ہوتی ہے کہ ایک قاری کے خوابیدہ نیک جذبات کو بیدار کرتی ہوئی اس کے ذکر و فکر اور نظر میں وسعت و بالیدگی بخشتی ہے۔ آپ کی شاعری میں جوش کلام، عارفانہ مستی، قلندرانہ جذب پاک بازانہ خودی، سیلف ریسپیکٹ، دوسروں کی عزت لطف تغزل، ٹھوس حقیقت، سوز و گداز، جوش حیات بے پایاں خوش اسلوبی و پاکیزگی۔ رندانہ بے نیازی و بے باکی بلند تخیلی اور اک عجب شان استغنا پائی جاتی ہے۔ محبت کی دھیمی آنچ اور پاک مٹی کی خوشبو آپ کے کلام کو دیگر شعرا سے ممیز کرتی ہے۔

آپ کے دیوان ''عشق تماشا'' کا آغاز ''نعت پاک رسول ﷺ'' کی عظمت سے ہوتا ہے۔ جو ایک محبت بھرا فلسفہ نبی ﷺ کا ورد مبارک کرتی ہوئی اجاگر ہوتی ہے۔

جسم کی قید میں ہوں پھر بھی ہوں میں آپ کی ساتھ
کس لیے روح نے کی نقل مکانی آقا (ﷺ)

کہ نوخیز کلیاں بھی عقیدت کی خوشبو نچھاور کرتی ہیں اور ہر دل و شجر و حجر پکار اٹھتا ہے۔

دل تو اس کے جمال میں گم ہے
سائیں سوہنا کمال میں گم ہے

اور واحدانیت کی لڑیاں مصفیٰ ہوا سے جھومتی ہوئیں مترنم ہوتی ہیں تو ایک نئی سوچ

دیئے امید کے بجھنے لگے ہیں
ہوا سے دوستی مہنگی پڑی ہے

جنم لیتی ہے کہ ایک قاری تخلیقی حسن میں منہمک ہوتے ہوئے یہ تمنا کرتا ہے:

ٹوٹے دل کی دعا محبت ہے ایک جلتا دیا محبت ہے
ہو محبت فنا تو عشق بنے عشق اللہ خدا محبت ہے

محبت کی دیوی بے باکانہ شوخی سے اندھیری گہرائیوں کے بھید عیاں کرنے کے لیے ایک بے ضرر انسان دوست مچھلی کی طرح غوطہ زن ہو کر جب سطح آب پر نمودار ہوتی ہے تو ملکوتی حسن بکھیرتے ہوئے لب کشائی کرتی ہے

بظاہر ہوں میں اک ناچیز قطرہ
میرے اندر سمندر بولتا ہے
نہیں معلوم یہ میں ہوں کہ تو ہے
مصور خود کسی تصویر سا ہے

نہیں شہناز کچھ رونے سے حاصل
جو ہونا تھا وہ آخر ہو گیا ہے

کی تکرار کے ساتھ شرماتے لجاتے ہوئے پھر کسی عجائبات کی ٹوہ میں بہت گہرے پانیوں میں اتر جاتی ہے۔

تند و تیز طوفان، گھنگور گھٹائیں اور دوری منزل اس کے جواں ارادوں کو متزلزل نہیں کر پاتے۔ ایک نسوانی پیکر، حسن کائنات، تصور وفا ''چلتی پھرتی لاش'' کی مانند آہستگی و ملائمت مگر ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یوں گویا ہوا:

عورت نام ہے ممتا کا
اور عورت تو بس ماں ہوتی ہے

اس کے الفاظ کی چاشنی اور لبوں کی تھرتھراہٹ اس عالم ناپائیدار کے مکینوں کو اس کے روٹھ جانے کے بعد بھی رہتی دنیا تک یاد رہے گی دائم آباد رہے گی۔ اس کی یادیں انمٹ ہیں تو باتیں انمول۔ اس کی لکھتیں لازوال ہیں تو اس کا لہجہ پر اثر!

جس کے شعر ضرب المثال بن گئے
جس کے استعاروں کا کہیں بدل نہ سنا
اس فہیم پیکر کا نام ''شہناز مزمل'' ہے۔

جس کی شاعری جس کا کلام لازوال و پر اثر ہے۔ جسے جناب نثار اکبر آبادی و دیگر شعرا و ادبا اور قارئین نے ''ولی کامل'' گردانا۔ جو دنیا سے بے نیاز، حقیقت و معرفت کی راہ پر بہت جرأت سے رواں دواں ہے۔ جس کی راہوں میں کانٹے دار جھاڑیاں، بے ترتیب پگڈنڈیاں اور گہری کھائیاں بھی ہیں تو اندھیرے خشک کنویں بھی۔ مگر وہ نڈر اور بے خوف و خطر چلی جا رہی ہے۔ پُر آشوب تاریک راہوں کے انہی بے آب کنوؤں کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خوف ناک

آوازیں آرہی ہیں:

کاتب وقت یہ منشور نہ لکھا جاتا
حوصلہ مند کو مجبور نہ لکھا جاتا
تخت سلطان اجڑتا نہ بچھڑتے ہم لوگ
شاہ کی ناز کو مجبور نہ لکھا جاتا

مگر وہ ان شوریدہ صداؤں کی پرواہ کیے بغیر بے لوث دھن میں مگن ایک نئی جہت، ایک نئی منزل اور تازہ افکار لیے پر امید بہت دلجمعی سے رواں دواں ہے۔ اس منزل کی طرف جس کے مکیں تازہ پھولوں کے ہار لیے اس کی اچھائیوں و اس کی لکھتوں کا اعتراف کرنے کے لیے منتظر ہیں۔

وہ منزل جہاں سکون ہے، انسانیت ہے، جہاں ظالم نہ ظلم، نہ تعصب، نہ مصائب نہ بخیلی نہ سستی، نہ خوشامد نہ جھوٹ، نہ لالچ نہ فریب۔

بس پیار ہی پیار، جہاں بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت برتی جاتی ہے۔ جہاں واحدانیت اور حب رسول ﷺ ٹھاٹھیں مارتی ہے۔

جس کے مکین بے لوث خدائی خدمت گار ہیں۔ جہاں خلوص و اخلاص و اخلاق کا بول بالا ہے۔ جہاں علم ہے تو ہنر بھی۔ جہاں کوئی شہریت کا بھوکا نہیں۔ وہ ریاکاری جیسے لفظ سے ہی نابلد ہیں۔

اس نگری کے پرندے اپنی ننھی ننھی چونچوں میں سرسبز انگور کی بیلوں کی نازک کونپلیں لیے اپنی محسنہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نگر کے باسی اپنے اسلاف سے شناسا ہیں۔ جنہیں عظیم شعرا کا کلام اور بڑے لکھاریوں کی لکھتیں حرف بہ حرف یاد ہیں، وہ ادب دوست ہیں اور دوستی بانٹنا جن کا شعار ہے۔

جن کے باطن اور ظاہر میں کوئی فرق نہیں اس نگر کے باسی اپنی سابقہ روایا کی طرح آج بھی محفل سجائے پنڈال کے بانسوں کے ساتھ پھول کی لڑیاں لٹکائے سرخ قالینوں پر اسٹیج کے اردگرد مودب بیٹھے ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔

آج کس کس کا آمد ہے؟ آج شمع کس کس کے آگے رکھی جا رہی ہے؟ آج کس کے کلام سے

ہم مستفیض ہوں گے؟ قمقمے جل اٹھے ہیں............

آج کی خاص شاعرہ شہناز مزمل کا نام سن کر ہلکی چہ میگوئیاں ذرا تیز ہو جاتی ہیں۔ مؤدب محفل۔ ذرا اوپر نیچے اپنے سروں کو کرتے قدرے بے چینی کا شکار ہوئے، سراپا انتظار ہے۔

......مزمل کی شہناز، ''ادب سرائے'' کی خادمہ۔ ادیبوں اور ادب نوازوں کی بہن اور بیٹی، ادب شناسہ، مایہ ناز شاعرہ جس کا اوڑھنا ہی ادب ہے، جس کے سب آج منتظر ہیں!

پھولوں کی لڑیاں ہاتھوں میں لیے، ادب دوست اصحاب جن کے پاس کتابیں بھی ہیں۔

مگر آج بیشتر کے پاس شہناز بیٹی کی ''عشق تماشا'' ہے ایک حقیقت بھرا دیوان جس میں حقیقت کے اشارے اور تصوف و معرفت شعرانہ رنگ میں سمو دیئے گئے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن ہوتی ہیں اس لیے مودب محفل منہ ہی منہ میں اپنے سر جھکائے ''عشق تماشا'' پڑھنے لگ جاتے ہیں اور آہستگی سے ایک دوسرے کو سناتے بھی ہیں۔ ایک صاحب!

مصور تو مری تصویر بن جا میرے کاتب مری تقدیر بن جا
تو اپنی ذات سے باہر نکل کر کتاب ورق کی تحریر بن جا

کی غزل، پہلی مرمراہٹ سے ذرا جاندار آواز میں سنا کر چپ ہوتا ہی ہے کہ ایک کونے سے اسی لہجہ اور اتنی ہی آواز میں مگر وہ آواز بھرپور نسوانیت سے مزین نہایت مترنم و سریلے سر میں

عرفان ذات نے مجھے حیران کر دیا
دوڑا رہا ہے مجھ کو مرا ذوق آگہی
روز ازل سے عشق کی مجھ کو تلاش تھی
جب سر جھکا دیا تو مجھے بندگی ملی

کی غزل چھیڑ دیتی ہے۔ ابھی مقطع پہ گائیکہ پہنچتی ہی ہے کہ مودب، سراپا انتظار ہجوم ایک اور حسینہ سے جس کے پاس ''عشق تماشا'' کے علاوہ ''سر منڈل'' بھی ہے، سے آپ کا کلام سنانے کی التجا کرتے ہیں۔

وہ دوشیزہ شرماتے لجاتے ہوئے سُر منڈل کی تاروں سے ذرا کھیل کر۔ موٹی موٹی آہو یانہ آنکھوں کو بند کیے نیم کلاسیکل انداز میں ''عشق تماشا'' کو کھولے بغیر

اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب
جاگتے جاگتے عمر گنوائی
عشق کی چھاؤں سونے دے اب

کی غزل مکمل کرتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی ہوئی محفل کو قدرے مدہوش پاتے ہوئے اٹھا ہی چاہتی ہے کہ ایک نوخیز منچلے نے بڑے پیار سے فرمائش کر دی۔

حسین ساحرہ مسکراتے لجاتے ہوئے پھر بیٹھ جاتی ہے اور خیالوں میں ''عشق تماشا'' کے اوراق الٹ پلٹ کرتی ہوئی سرمنڈل کی تاروں کو مضراب کی ہلکی نوک سے چھیڑتے ہوئے اپنے گلابی ہونٹوں کو پھر معمولی جنبش دے کر غزل سرا ہوتی ہے۔

ہر وقت کیے رکھتا ہے دل مجھ کو ہراساں
کچھ کام مجھے ڈھنگ سے کرنے نہیں دیتا
دشمن ہے ہواؤں کا بدلتا ہوا موسم
گھر ان کا کسی پیڑ پہ رہنے نہیں دیتا

دھیمے سروں سے غزل کو سمیٹتے ہوئے مزید فرمائشوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی پسندیدہ غزل نیم وا آنکھوں سے خود ہی شروع کر دیتی ہے۔

بہت سے کام ادھورے ہی چھوڑ کر شہناز
پلٹ کے گھر بھی تو جانا بہت ضروری تھا

اور اس کے بعد

وقت کے بدلنے سے قسمتیں بدلتی ہیں
آؤ ہم دعا مانگیں آیتوں کے موسم میں

گانے لگتی ہے کہ محفل پہ سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ رات ڈھلتی جا رہی ہے کوئی ہونٹک نہیں کرتا۔ مگر چند منچلے دور سے آتی ہوئی لمبی سڑک کی طرف گردنیں گھمائے ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں کہ کب صاحب دیوان شاعرہ شرف باریابی بخشیں گی۔

ایک بزرگ کی فرمائش پر حسین گائیکہ سرمنڈل بکف تاروں کو اک نئی ترتیب سے جنبش دیتی ہوئی

چاند سے مزین ہلکی تاریکی میں اپنے یاقوتی ہونٹوں کی شکایتی ادا سے پھر غزل سرا ہوئی:

ہم راز داں کسی کو بناتے تو کس طرح

ہر شخص اپنی ذات کے اندر چھپا ملا

دورانِ غزل کی گائیکی کے آہو چشم فنکارہ نہایت آہستگی سے اپنی آنکھیں جب جھپکتی ہے تو دو موٹے موٹے آنسو اس کی جھولی میں پڑے سرمنڈل اور شہناز جی کے ''عشق تماشا'' کو تر کر دیتے ہیں۔ حاضرین محفل سبھی سوگوار ہو جاتے ہیں۔ سریلی دوشیزہ بے ہوشی کے عالم میں ٹپ ٹپ آنسو گراتی اور دیوانہ وار ''عشق تماشا'' کو فرطِ جذبات سے چومتی ہوئی سرمنڈل تھامے اٹھ کھڑی ہوئی تو تمام مؤدب محفل حالتِ قیام کی طرح کھڑی ہوگئی۔ وہ ابھی ایک قدم ہی اٹھاتی ہے کہ مؤدب مجمع اس کے لیے لمبا راستہ خالی کر دیتا ہے۔ جو اسی سڑک سے جا ملتا ہے جس سڑک سے محترمہ شہناز مزمل کی...... بارہ گھوڑوں والی رتھ متوقع ہے۔

مؤدب مجمع سراپا انتظار، تشنہ تشنہ پھر اپنے سر دائیں بائیں گھماتا ہے۔ جنہیں اپنی میر محفل، مہمان خصوصی شہناز مزمل کا انتظار ہے۔ جن کے ساتھ شام منانے کے لیے ایک ماہ پہلے اشتہارات لگے تھے لیکن یہ نگر تو سچوں کا نگر ہے، جہاں وعدے ایفا ہوتے ہیں۔ شام ڈھل جائے یا گہری رات......... مؤدب محفل بیٹھی ہے......... بیٹھی رہے گی جب تک.........

دعا گو

بڑا بھائی: سعید احمد بودلہ

538/F-II جوہر ٹاؤن لاہور فون

# جادۂ عرفاں

## عرفان وسلوک کے تجربات ومشاہدات پر مبنی محترمہ شہناز مزمل کا مجموعہ کلام

### شاہد بخاری ایم اے ایل ایل بی

جادہ عرفان کے مسافر نے علم وادب کی بہت سے مجازی سفر کرنے کے بعد عرفان وسلوک منزل کا رخ کیا ہے۔ مسافر یہ جانتا ہے کہ بسیار سفر پابند ما پختہ سفر خامے، اس لیے اس کے اس تجربہ میں پختگی نمایاں ہے۔ اس دشوار گزار راستے میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں مگر وہ فگار دل، فگار ہاتھوں اور فگار آنکھوں سے مرحلہ شوق طے کرنے کا حوصلہ ذوق جستجو اور تلاش کی لگن سے جوئے شیر لانے میں کامیاب وکامران نظر آتی ہیں میرے خیال میں جن لوگوں کو تصوف کی راہ میں مشکل مقامات سے خوف آتا ہے، وہ جادۂ عرفان کو بغور پڑھیں تو ان کا یہ سفر آسانی سے طے ہوگا۔ ہر مقام اور ہر راستے کی ہر مشکل کے بارے میں مکمل رہنمائی ملے گی اور بقول آتش وہ یہ محسوس کرے گا کہ:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

اگر اس دور کے تنگ نظر ملا، میدان تصور میں عورت کی حکمرانی کو برداشت کر سکتے ہوں اور وہ حضرت رابعہ بصری کے پاکیزہ خیالات اور اقوال کا مطالعہ کریں تو ان کو محترمہ شہناز مزمل کے اشعار میں ان کی خوبصورت ترجمانی ضرور ملے گی۔

من تو شدی تو من شدی کے مصداق

اپنا آپ تو مجھ کو دے دے
میرا سارا جیون لے لے
تیرا ساتھ مجھے مل جائے

پھر کیا غم ہے

سارے موسم میرے موسم

رنگ دھنک میں جتنے بھی ہیں

رنگ وہ سارے پھر میرے ہیں

اپنا قطرہ حقیقت میں دریا ہونے کے ادراک کے باوجود پردہ رکھتے ہوئے کہتی ہیں:

میری تجھ سے ہے یہی التجا
مجھے اپنے آپ سے دے ملا

اور پھر کیا خوب کہا ہے:

گرد آلود ہے ملبوس سفر سے پہلے
منزل آئی ہے نظر راہ گزر سے پہلے

خوشبو اپنے کمالات خود منوا لیتی ہے اس کے لیے کسی عطار کو کچھ کہنا نہیں پڑتا

مذہب اسلام سے عقیدت و محبت اور اس پر کامل یقین ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ جس کا پرچار جابجا ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

مذہب اسلام کے احکام کو ایمان بنا
مذہب اسلام ہی قرآن کی تفسیر ہے
کوئی دشمن بھی تجھے تسخیر کر سکتا نہیں
تو خدا کے فضل سے ناقابل تسخیر ہے

............

چلیں تیرے محبوب کے راستے پر
یہ شام و سحر ہم دعا مانگتے ہیں
سدا کام آتے رہیں دوسروں کے
یہ جذبات رب العلیٰ مانگتے ہیں

غالب کا تو ہر خواہش پہ دم نکلتا ہے لیکن شہناز کی خواہشوں پر رشک آتا ہے:

خواہش بڑی دیرینہ ہے اس قلب حزیں کی

مامور حرم ہونا مقدر ہو ہمارا
زمین کعبہ و بطحا پہ کر سکوں سجدے
نگاہ لطف سے یہ انتظام کر دینا

اور پھر:

مجھ کو طیبہ کی گلیوں میں گھر ہو عطا

لوگ حضوری کی کیفیت کا رتبہ بلند پانے کے لیے ساری عمر تڑپتے اور آہ وفغاں کرتے رہتے ہیں شہناز خوش قسمت ہیں کہ انہیں منزل کا آسرا مل گیا۔ یزداں نے ان کے جذبے کی تکمیل کر دی۔

اس کی رضا سے اذن تقرب عطا ہوا
پھر فاصلہ بھی راہ میں حائل نہیں رہا
نیرنگی جمال نے مبہوت کر دیا
تھا شہر سارا آئینہ خانہ بنا ہوا
شہناز کو نصیب گیا لے کے اوج پر
ذرے کا آفتاب سے کب تھا مقابلہ

عشق خدا اور عشق رسول ہی جادۂ عرفان ہے اور یہ فیضان مدینہ نبی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔اس لیے تو جا بجا انہوں نے کہا ہے کہ:

پرواز کو بے تاب ہیں پھر پر مرے آقا
اڑنے کے لیے مجھ کو مدینے کی فضا دے
روح میری تیرے جلوؤں کی ازل سے پیاسی
میں تو اے شہر مدینہ تیرے منظر مانگوں

علامہ اقبال نے بالکل درست فرمایا کہ زباں سے پڑھ بھی لیا لا الہ تو کیا حاصل؟ دل ونگاہ کیسے مسلمان ہوگی؟ دین کا ایمان کا عرفان کیسے ہوگا اور پھر کیا رتبہ ملے گا؟ محترم عام فہم انداز میں بتلاتی ہیں کہ:

حرام اس پر ہوئی نار جہنم جس مسلمان نے
پڑھا قرآن اور تفسیر سے رکھی شناسائی

جادۂ عرفان کس کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوگا۔اس کتاب کو طاق سے اتار کر، گرد پونچھ کر، ہاتھوں میں تھامیں، اس کی قسمیں کھانے کے لیے نہیں بلکہ:

فرسودۂ قرآن پہ دن رات عمل کر
مل جائے گی منزل رہ اسلام پہ چل کر

جادۂ عرفان کے حسن طلب میں بھی انہوں نے کمال کر دکھایا ہے:

گدائے طیبہ کو اتنی ہی بھیک کافی ہے
عطا ہو وعدہ دم حشر بس شفاعت کا
شہناز کی نہیں ہے کوئی اور آرزو
باب رسول کی اسے مولا گدائے دے

اور پھر آخر میں:

اپنے آپ میں کھونے دے اب
عشق تماشا ہونے دے اب

............

عشق سمندروں نے میرے
جیون ناؤ ڈبونے دے اب

یہ ہے جادۂ عرفاں کے مسافر عشق کی انتہاء۔